

**عنوان البحث**

# بیسویں صدی عیسوی میں ہندوستانی مسلمانوں کی تعلیمی پسماندگی-ایک جائزہ

**اعدادالطالب**


محمد ثاقب قاسمی بن صابر عالم صاحب

**الرقم الجامعی ۸۷۱**

قسم الادب العربی


**تحت إشراف**

حضرت مولانا محمد شمشاد رحمانی قاسمی صاحب

استاذ تفسیر وادب دار العلوم وقف دیوبند

**قسم الأدب الجامعة الاسلامية دارالعلوم وقف ديوبند**

العام الجامعی ۲۰۱۶م ۱۴۳۷ھ

باحث: ــــــــــــــــ محمد ثاقب قاسمی (مالیرکوٹلہ، پنجاب)
مشرف: ــــــــــــــــ مولانا محمد شمشاد رحمانی قاسمی صاحب
باہتمام: ــــــــــــــــ حجۃ الاسلام اکیڈمی دارالعلوم وقف دیوبند
سن: ــــــــــــــــ ۱۴۳۷ھ-۲۰۱۶م
صفحات: ــــــــــــــــ ۷۵
کمپوزنگ: ــــــــــــــــ اعجاز گرافکس نزد دارالعلوم وقف دیوبند

## نوٹ

اس مقالہ کا استعمال باحث کی اجازت کے بغیر کسی بھی طریقہ اور کسی بھی صورت میں درست نہیں۔

ہاں! مندرجہ ذیل صورتوں میں اس کی اجازت ہے:

(۱) اگر کوئی اس مقالہ سے اقتباس لینا چاہے تو اس کی اجازت ہے، مگر اس شرط کے ساتھ کہ اس اقتباس کی نسبت اس مقالہ کی طرف کی جائے۔

(۲) حجۃ الاسلام اکیڈمی دارالعلوم وقف دیوبند کو اس کی اجازت ہے کہ وہ علمی اور تحقیقی جستجو کے لیے اس کا استعمال کسی بھی طریقہ سے کرسکتی ہے، نیز تجارتی مفاد کے لیے ممنوع ہے۔

(۳) حجۃ الاسلام اکیڈمی دارالعلوم وقف دیوبند کو کسی کتب خانہ یا کسی ریسرچ سنٹر کے مطالبہ پر اس مقالہ کے نشر و اشاعت کی اجازت ہے۔

وَمَنْ يُؤْتِ الْحِكْمَةَ فَقَدْ أُوتِيَ
خَيْراً كَثِيْراً

من يرد الله به خيرًا يفقه فى الدين

(مسلم: الزكاة: باب النهى عن المسألة ٢/ ٧١٧، ح٩٨)

# صفحة الاقرار

دستخط ڈائریکٹر — Director

دستخط مشرف — Supervisor

دستخط ممتحن — Examiner

# انتساب

احقر اپنی اس کاوش کو چار افراد کی طرف منسوب کرنا باعثِ سعادت سمجھتا ہے۔

(۱) اپنے والدین، دادا جان، اور نانی جان کے نام جن کی نیک خواہشوں، کوششوں اور ان حضرات ہی کی دعاؤں کے طفیل سے میں اس لائق بنا۔

اللہ تبارک وتعالیٰ ان حضرات کی عمر میں برکت فرمائے اور ان کے سایے کو ہمارے اوپر دراز فرمائے۔آمین

(۲) اپنی دادی جان اور نانا جان کے نام جن کی آغوش محبت میں رہ کر میری پروش ہوئی۔

اللہ پاک ان حضرات کی مغفرت فرما کر جنت میں اعلیٰ علیین میں مقام کریم عطا فرمائے۔آمین

(۳) اپنے تمام مشفق ومربی اساتذہ کرام کے نام جو میری صلاحیت کی نشو ونما اور ترقی کا اصل سبب ہے، جن کی نیک توجہات، شبانہ روز کی محنتوں اور نصیحتوں نے اس حقیر کو اس لائق بنایا۔

رب کریم ان حضرات کے سایۂ عاطفت کو تا دیر قائم رکھے۔آمین

(۴) مدرسہ عربیہ حفظ القرآن جماپورہ، مالیر کوٹلہ اور مادر علمی دار العلوم وقف دیوبند کے نام کہ جس کے زیر نگرانی میں نے اس عظیم الشان موضوع پر قلم اٹھایا، اور کسی حد تک اس کو بہترین بنانے کی کوشش کی، کم علمی کے احساس کے باوجود اپنے مشفق اساتذہ کرام کی جانب سے بہترین رہنمائی اور ہمت افضائی نے احقر کے حوصلے کو بلند کیا۔

مالک ارض وسماء ان اداروں کو ہمیشہ قائم ودائم رکھے، اور ان کو دن دوگنی اور رات چوگنی ترقی عطا فرمائے۔آمین

# کلمات تشکر

سب سے پہلے میں خداوند قدوس کا شکر گزار ہوں کہ جس نے محض اپنے فضل و کرم سے مجھ بندۂ ناچیز کو ایمان کی دولت سے سرفراز فرمایا، اور اپنی مرضیات و منہیات کے شعور وآگہی کے لئے مادر علمی دارالعلوم وقف دیوبند میں تحصیل علم دین کا حسین موقع عنایت فرمایا۔

اس کے بعد میں اپنے والدین، مشفق اساتذۂ کرام اور مخلص احباب و دوست کی خدمت میں ہدیہ تشکر پیش کرتا ہوں جنہوں نے میرے اس علمی سفر میں قدم قدم پر میری مدد فرمائی، یہ انہیں کی شفقت و محبت، جدوجہد اور تعلیم و تربیت کا نتیجہ ہے کہ آج یہ بندۂ ناچیز تحصیل علم دین جیسی عظیم شاہراہ کا راہی اور مادر علمی دارالعلوم وقف دیوبند کا طالب علم ہے۔

خصوصاً شکر یہ ادا کرنا چاہتا ہوں دارالعلوم وقف دیوبند کے تمام اساتذۂ کرام کا جن کے مفید مشوروں، مخلصانہ دعاؤں اور خصوصی توجہات سے کچھ لکھنے کا حوصلہ ملا۔

طالب دعا

محمد ثاقب قاسمی (مالیر کوٹلہ، پنجاب)

# ملخص بحث

باحث نے اپنے مقالہ ''بیسویں صدی عیسوی میں ہندوستانی مسلمانوں کی تعلیمی پسماندگی-ایک جائزہ'' کوایک جگہ جمع کرنے کی ایک طالب علمانہ کوشش کی ہے۔

یہ مقالہ دوفصلوں پر مشتمل ہے۔فصل اول میں ہندوستان کے مسلم دورحکومت کے تعلیم وتعلم کا تاریخی جائزہ کو بیان کیا جائے گا۔

یہ فصل دومباحث پر مشتمل ہے۔مبحث اول میں بیسویں صدی عیسوی میں ہندوستانی مسلمانوں کی تہذیب وثقافت کی تاریخ کو بیان کیا جائے گا،مبحث ثانی میں مغلیہ دورحکومت اورنظام تعلیم کو بیان کیا گیا ہے۔

فصل ثانی میں مسلمانان ہند کی تعلیم پسماندگی-اسباب اورحل کو بیان کیا جائے گا۔

یہ فصل پانچ مباحث پر مشتمل ہے۔مبحث اول میں بیسویں صدی عیسویں میں نصاب تعلیم قوم کی فکری ارتقاءاور ذہنی صلاحیت کا آئینہ دارکو بیان کیا گیا ہے،مبحث ثانی میں مدارس اسلامیہ کا نصاب تعلیم اورعصر حاضر کے تقاضے کو بیان کیا گیا ہے،مبحث ثالث میں ہندوستان میں مسلم بچوں کا تعلیمی مسئلہ کو بیان کیا گیا ہے،مبحث رابع میں نظام تعلیم میں نظرثانی کی ضرورت کو بیان کیا گیا ہے،مبحث خامس میں تعلیمی پسماندگی کے وجوہات اورحل کو بیان کیا گیا ہے۔

# فہرست مضامین

# مقدمہ

**الحمدلله رب العالمین والصلوة والسلام علی سید الانبیاء والمرسلین وعلی آله واصحابه اجمعین اما بعد:**

کسی بھی ملک وقوم کی ترقی وخوشحالی کا دارومدار تعلیم پر ہوتا ہے، جس ملک وقوم میں تعلیم کو اہمیت دی جاتی ہے وہ ہمیشہ زندگی میں لوگوں پر اوران کے دلوں پر راج کیا کرتے ہیں۔

یوں تو ہندوستان دنیا کا سب سے بڑا جمہوری ملک ہے جس نے ہر سطح پر بڑھ چڑھ کر ہر میدان میں حصہ لیا، ہندوستان کی جہاں سیاست کا چرچہ ہے وہیں اس کے علمی کارناموں سے بھی تاریخ کے اوراق بھرے پڑے ہیں جس میں مسلمانوں کی فکر ونظر کو خاص دخل ہے، جنہوں نے اس ملک کے لیے اپنی پوری زندگی کو صرف کردیا، چاہے وہ تعلیم کا میدان ہو یا سیاست کا، یا سائنس کے شعبوں کا، یا اداروں کو وجود میں لانے کا، نیز تعلیم کے ہر میدان میں مسلمانوں کا مجددانہ کارنامہ رہا ہے؛ کیونکہ تعلیم کا ہی یہ کمال ہے کہ انسانوں کو جہالت وگمراہی کے اندھیروں سے نکال کر علم وآگاہی کی روشنی میں لاتا ہے، تعلیم ہی کے ذریعہ آدمی ایمان ویقین کی دنیا آباد کرتا ہے، بھٹکے ہوئے لوگوں کو سیدھا راستہ دکھاتا ہے، بروں کو اچھا بناتا ہے، دشمن کو دوست بناتا ہے، بےگانوں کو اپنا بناتا ہے اور دنیا میں امن وامان کی فضا پیدا کرتا ہے، تعلیم ہی بنی آدم کو شعور وفہم بخشتا ہے، پوری دنیا کے ترقی پذیر ممالک نے تعلیم کی اہمیت کو سمجھا اور اپنے شہریوں میں تعلیم کو فروغ دے کر بلندیوں کو چھوا۔

اسی طرح ہر دور میں ہندوستان کا تعلیمی میدان میں کچھ نمایاں امتیاز رہا ہے؛ لیکن چونکہ ان میں سے ہر دور تعلیم کے اعتبار سے مختلف رہا ہے، تو ضرورت تھی اس بات کی کہ اس موضوع پر ہزاروں صفحات بھی قلمبند کیے جائیں تو کم ہوگا؛ مگر باحث کے مقالہ کی کمیت کے پیش نظر ''بیسویں صدی عیسوی میں ہندوستانی مسلمانوں کی تعلیمی پسماندگی-ایک تجزیہ'' کو جامع اور مختصر انداز میں پیش کرنے کی ضرورت کو محسوس کیا ہے، تاکہ عوام کی تعلیم سے بڑھتی بےتوجہی کو تعلیم کی طرف مبذول کرایا جائے۔

# فصل اول

## ہندوستان کے مسلم دور حکومت کے تعلیم و تعلم کا تاریخی جائزہ

یہ فصل دو مباحث پر مشتمل ہے

مبحث اول: ـــ بیسویں صدی عیسوی میں ہندوستانی مسلمانوں کی تہذیب وثقافت کی تاریخ

مبحث ثانی: ــــــــــــــــــــــــ مغلیہ دور حکومت اور نظام تعلیم

# مبحث اول: بیسویں صدی عیسوی میں ہندوستانی مسلمانوں کی تہذیب وثقافت کی تاریخ

## عرب، ہندو پاک کے قدیم تعلقات

عرب و، ہندو پاک کے تعلقات بہت پرانے ہیں، ان دونوں علاقوں بالخصوص سندھ اور جنوبی عرب کے سواحل اس قدر قریب ہیں کہ ان کے درمیان تجارتی تعلقات اور دوسرے روابط قائم ہو جانا ناگزیر تھا۔

عرب اور ہندو پاکستان کے درمیان قدیم الایام سے ایسے تجارتی روابط قائم ہو گئے ہیں، جنہوں نے دونوں علاقوں ہی نہیں بلکہ پوری دنیا کی تاریخ پر اثر ڈالا اور جن کی تصدیق سے مؤرخین کو انکار نہیں ہے، ہندوستان کی پیداوار اور دوسرے مال و اسباب کی اہل یورپ اور اہل مصر کو ہمیشہ سے ضرورت رہی ہے، عرب تاجر جہازوں کے ذریعہ ہندوستان بندرگاہوں سے یمن اور وہاں سے خشکی کے راستے ملک شام پہنچاتے، جہاں یہ چیزیں پھر جہازوں میں لدتیں اور یورپ تک پہنچتیں۔ (۱)

## فتح سندھ

جب عرب نور اسلام کی روشنی سے منور ہوا تو عرب اور ہند کے یہ دیرینہ تعلقات منقطع نہ ہو گئے، مسلمان ملاحوں اور تاجروں نے اپنے پیشروؤں کا کام برقرار رکھا اور اپنی کشتیاں اور جہاز لے کر عرب سے ہندوستان اور سری لنکا کے سواحل پر آتے جاتے رہے؛ لیکن جلد ہی ان کاروباری تعلقات کے ساتھ ساتھ سیاسی روابط بھی شروع ہو گئے، جو شروع میں اس قدر خوشگوار نہ تھے۔

اسلامی عرب اور خطۂ ہندو پاکستان کا پہلا واسطہ جس کا تواریخ میں ذکر ہے، آغاز اسلام کے تھوڑے ہی عرصے بعد حضرت عمرؓ کے عہدِ خلافت میں ظہور پذیر ہوا اور یہ راستہ مخالفانہ تھا، مشہور مؤرخ طبری لکھتے ہیں کہ حضرت عمرؓ کے زمانے میں حکم بن عمرو تغلبی اسلامی فوج لے کر مکران جا رہے تھے کہ راستے میں ایرانی فوج نے ان کا مقابلہ کیا، ایرانیوں نے اپنی مدد کے لیے سندھ کے راجہ سے فوج منگائی تھی جو عربوں کے خلاف صف آراء ہوئی؛ لیکن ایران اور سندھ کی متحدہ فوجوں کو شکست

(۱) تاریخ ہندوستان (آب کوثر)، ص:۱۹-۲۰، مصنف: شیخ محمد اکرام، مکتبہ: ادبی دنیا مٹیا محل دہلی ۱۱۰۰۰۶۔

ہوئی، اور جو مالِ غنیمت عربوں کے ہاتھ آیا اس میں ہندوستان کے ہاتھی بھی تھے، اس زمانے میں بحرین کے عرب گورنر عثمان بن ابی العاص الثقفی نے حضرت عمرؓ کی اجازت کے بغیر عمان کے راستے ساحل ہند پر ایک لشکر بھیج دیا جو علاقۂ ممبئی میں مقام تھانہ (Thana) تک آیا، یہ لشکر بخیر و عافیت عرب واپس پہنچا؛ لیکن حضرت عمرؓ نے جو بحری مہموں اور پر خطر لڑائیوں کے خلاف تھے، والیِ بحرین کو ایک خفگی کا خط لکھا، اور ایسی مہموں کی ممانعت کر دی، اس کے بعد متعدد عرب افسروں کے بھروچ اور سندھ میں مختلف مقاصد سے آنے کا ذکر ملتا ہے؛ لیکن حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ ہندوستان پر فوج کشی کے مخالف تھے، اور اگر چہ سندھ کی سرحد پر مکران کے مسلمانوں اور سندھ کے راجوں میں گاہے گاہے چھیڑ چھاڑ ہوتی رہی؛ لیکن عربوں نے خلیفہ ولید بن عبدالملک کے زمانے تک ہندوستان پر باقاعدہ چڑھائی نہیں کی، اور اس وقت بھی واقعات نے انہیں مجبور کر دیا۔

اس زمانے میں عراق کا گورنر حجاج بن یوسف تھا، جو عرب کی تاریخ میں اپنی بہادری، انتظامی قابلیت اور ظلم وستم کے لیے مشہور ہے سندھ میں راجا داہر حکمران تھا، داہر نے اس سے پہلے ہی ان عربوں کو پناہ دے کر جنھوں نے مکران کے گورنر سعید بن اسلم کو قتل کیا تھا، عرب حکومت سے مخالفت کی بنیاد رکھ دی تھی، لیکن خلیفہ وقت ہندوستان پر لشکر کشی کے خلاف تھا اور اس نے راجا کے ساتھ لڑائی ضروری نہ سمجھی۔

اس واقعہ کے چند سال بعد لنکا سے کچھ جہاز ان تحائف سے لدے ہوئے عرب آرہے تھے جو لنکا کے راجے نے حجاج کو بھیجے تھے، ان کے ساتھ کئی مسلمان تھے جو حج کو جارہے تھے اور ان مسلمانوں کی بیویاں اور بچے بھی تھے، جو لنکا میں وفات پاگئے تھے، بادِ مخالف ان جہازوں کو ساحل دیبل پر لے گئی جو (موجودہ کراچی سے تھوڑی دُور) مملکتِ سندھ کی بڑی بندرگاہ تھی، یہاں دیبل کے مید لوگوں نے ان جہازوں کا مال واسباب لوٹ لیا اور عورتوں اور مردوں کو گرفتار کر کے اندرونی علاقے میں لے گئے، حجاج کو یہ خبر ملی تو اسے بڑا طیش آیا، اس نے راجا داہر کے پاس ایک سفیر بھیجا تا کہ وہ گرفتار شدہ مردوں اور عورتوں کو رہا کرائے اور تحفے دارالخلافہ پہنچائے، راجا نے سفیر کو جواب دیا کہ ''یہ سب کام بحری ڈاکوؤں کا ہے اور میرا ان پر کوئی زور نہیں'' حجاج اس جواب سے مطمئن نہ ہوا اور اس نے راجا داہر کو قرار واقعی سبق سکھانے کے لیے ہندوستان پر حملے کا فیصلہ کیا، پہلے عبداللہ اور بدیل کے زیر قیادت مکران سے لشکر بھیجے گئے، لیکن راجا داہر کے بیٹے جے سنگھ نے انھیں شکست دی اور دونوں سپہ سالار لڑائی میں شہید ہوئے، حجاج کو ان شکستوں کا بڑا رنج ہوا، بالخصوص بدیل کی موت

نے اسے بہت متاثر کیا، چنانچہ اس نے خلیفۂ وقت ولیدؒ کی منت سماجت کر کے ہندوستان میں پورے انتظامات کے ساتھ ایک خاص انتقامی لشکر بھیجنے کی اجازت لی اور اس کی قیادت کے لیے اپنے داماد اور چچازاد بھائی عمادالدین محمد بن قاسم کو چنا جس کی عمر اس وقت صرف سترہ برس کی تھی۔

محمد بن قاسم چھ ہزار سوار لے کر خشکی کے راستے ۷۱۱ء کے موسم خزاں میں دیبل پہنچا اور شہر کا محاصرہ شروع کیا، کئی روز تک کامیابی نہ ہوئی لیکن بالآخر العروس نامی ایک بڑی منجنیق کی مدد سے جسے پانسو آدمی چلاتے تھے، شہر فتح ہوگیا، اور محمد بن قاسم نے قلعے پر قبضہ کر کے ان قیدیوں کو رہا کیا جو لنکا کے جہازوں سے گرفتار ہوئے تھے، دیبل سے محمد بن قاسم (موجودہ حیدآباد کے قریب) نیرون گیا جہاں کے حاکم نے بغیر لڑائی کے ہتھیار ڈال دیئے، پھر سہوان کی باری آئی یہاں کا حاکم راجہ داہر کا بھتیجا تھا، شہر کے لوگوں نے اس کے خلاف بغاوت کر کے عربوں کی اطاعت قبول کر لی، اس کے بعد محمدؒ بن قاسم نے بہمن آباد کا رخ کیا اور راوَاور بہمن آباد کے مقامات پر راجا داہر اور اس کے بیٹے جے سنگھ کو شکست فاش دی، جواں ہمت سپہ سالار پھر ملتان کی طرف بڑھا اور ۷۱۳ء میں یہ تاریخی مقام بھی فتح ہوگیا، اس طرح دو سال کے عرصے میں سندھ اور ملتان کا سارا علاقہ عربوں کے ہاتھ آ گیا، لیکن عرب سپہ سالار کا انجام اچھا نہ ہوا۔

چچ نامہ کے بیان کے مطابق محمدؒ بن قاسم کی فوجیں شمالی پنجاب کے اس مقام تک پہنچیں، جہاں دریائے جہلم میدانی علاقے میں داخل ہوتا ہے اور جہاں کشمیر اور راجا داہر کے مقبوضات کی حدیں ملتی تھیں، محمد بن قاسم کا ارادہ مشرقی سمت بڑھنے کا تھا، چنانچہ اس نے قنوج کے راجے کو، جس کی حکومت مغرب میں اجمیر (اور غالباً وسطی پنجاب) تک پھیلی ہوئی تھی، پیغام جنگ بھیجا، لیکن یہ منصوبے پورے نہ ہوے، ۷۱۴ء کے وسط میں اس کے خُسر اور سرپرست حجاج کی وفات ہوگئی، جس کی وجہ سے محمدؒ بن قاسم کو متامل ہونا پڑا، اگلے سال کے شروع میں خلیفۂ وقت ولید چل بسا اور اس کے بعد تو دمشق میں ایک طرح کا انقلاب ہوگیا، ولید کا جانشین اس کا بھائی سلیمان ہوا، جس کی حجاج سے پرانی عداوت تھی، اس نے حجاج کے تمام اقارب اور دوستوں کے خلاف دستِ تعدّی دارز کیا، محمدؒ بن قاسم کو سندھ سے واپس بلا بھیجا اور اسے اور اس کے عزیزوں کو سخت ایذائیں دے کر مرواڈالا۔(۱)

## علمی اور تمدنی روابط

عرب اور ہندو پاکستان کے تجارتی تعلقات پرانے ہیں لیکن جب سندھ عرب حکومت کا ایک

(۱) مرجع سابق، ص: ۲۰-۲۴۔

ماتحت صوبہ بن گیا تو عربوں اور اس سرزمین کے باشندوں (بالخصوص سندھیوں) کے درمیان گہری راہ ورسم کا دروازہ کھل گیا، اور پھر جب عباسیوں نے دمشق کی جگہ بغداد کو اپنا دارالحکومت بنایا تو ''ہندو سندھ'' سے عربوں کا علمی، مذہبی اور سیاسی مرکز اور بھی قریب ہو گیا، اس قرب سے خلفائے بغداد نے بہت فائدہ اٹھایا اور ہندوستان کی علمی ترقیوں سے اپنے آپ کو پوری طرح باخبر کیا، عرب اس وقت دنیا کی ساری قوموں سے سربلند تھے، چین کی سرحد سے اسپین کے ساحل تک ان کا پرچم لہرا رہا تھا، لیکن وہ جانتے تھے کہ دنیاوی تفوق حاصل کرنے اور حاصل کرکے اسے برقرار رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ ''دَعْ مَا کَدَرَ وَخُذْ مَا صَفَا'' کے اصول پر عمل ہو اور علمی ترقیاں جہاں کہیں بھی ہوں ان سے خبردار رہا جائے، ہندوستانی ان کے محکوم تھے لیکن انہوں نے محکوموں اور ماتحتوں سے سبق سیکھنے سے گریز نہ کیا اور کئی ہندوستانی کتب کو عربی میں منتقل کرکے ان کے مطالب اخذ کیے۔

ہندوستان کی پہلی کتاب جس کا عربی میں ترجمہ ہوا، سدھانت تھی، ۱۷۷۱ء میں سندھ کے ایک وفد کے ساتھ ہیئت اور ریاضیات کا ایک فاضل پنڈت یہ کتاب لے کر بغداد پہنچا اور خلیفہ کے حکم سے ایک عرب ریاضی دان نے اس کا عربی میں ترجمہ کیا۔ یہ کتاب علم ہیئت میں تھی اور عربی میں ''السند ہند'' کے نام سے مشہور ہوئی۔ اس کتاب نے عربوں کے علم ہیئیت پر گہرا اثر ڈالا ہندو فاضل کے بغداد میں کئی شاگرد ہوئے جنھوں نے سدھانت کے اصولوں کو اپنے اپنے طرز پر عربی میں منتقل کیا، اس کے تھوڑے عرصہ بعد اس علم کی مشہور یونانی کتاب مجسطی کا عربی میں ترجمہ ہو گیا۔ اور خلیفہ مامون کے زمانے میں ایک رصد خانہ تیار ہو جانے سے کئی نئی تحقیقات ہوئیں لیکن ان سب ترقیوں کے باوجود ایک مدت تک عربی عرب ہیئت دان بغداد سے لے کر اسپین تک اس ہندی کتاب سدھانت کے پیچھے لگے رہے اس کے خلاصے کئے اس کی شرحیں لکھیں۔ اس کی غلطیاں درست کیں اس میں اصلاحیں کیں یہاں تک کہ گیارہویں صدیں عیسوی یعنی البیرونی کے زمانے تک یہ سلسلہ قائم رہا، اب بھی عربی میں علم ہیئت کی چند اصطلاحیں ایسی باقی ہیں جن میں ہندوستانی علم ہیئیت کا اثر نظر آتا ہے۔ علم ہیئت کے علاوہ علم حساب میں بھی عرب ہندوستانیوں سے اور تمام اہل مغرب عربوں سے مستفید ہوئے عربوں کا بیان ہے کہ انھوں نے حسابی رقم (ہندسے) لکھنے کا طریقہ ہندوؤں سے سیکھا۔ اس لئے وہ ہندسوں کو حساب ہندی یا ارقام ہندیہ کہتے تھے اقوام یورپ نے یہ ہندسے عربوں سے سیکھے اس لئے وہ انھیں اعداد عربیہ کہتے ہیں اس سے پہلے عرب لفظوں میں عدد لکھتے تھے پھر حروف ابجد میں لکھنے لگے اور اہل مغرب رومن ہندسوں میں (جن کا استعمال بہت پیچیدہ تھا) اعداد کو بیان

کرتے تھے یہ امر صحیح طور پر معلوم نہیں کہ ''ارقام ہندیہ'' عرب میں کب پہنچے لیکن خیال ہے کہ جو پنڈت سدھانت لے کر بغداد گیا تھا اسی نے عربوں کو حساب کا نیا طریقہ سکھایا ہوگا۔

علم ہیئت اور حساب کے علاوہ ہندوستانی طب پر عربوں کی خاص نظر تھی اور ہندوستان کے دید عرب میں بڑے مقبول تھے ایک دفعہ خلیفہ ہارون رشید سخت بیمار پڑا اور تمام عرب اطبّا اس کے علاج سے عاجز آ گئے اس پر ایک شخص نے مشورہ دیا کہ ہندوستان سے منکہ (مانک؟) نامی وید کو بلایا جائے چنانچہ خلیفہ نے سفر خرچ بھیج کر اسے بلوایا اور اس کے علاج سے خلیفہ کو صحت ہوگئی خلیفہ نے خوش ہو کر اسے بہت انعام و اکرام دیا اور پھر اسے دار الترجمہ میں سنسکرت کی کتابیں ترجمہ کرنے پر مامور کیا اسی طرح ایک اور ہندوستانی طبیب نے ہارون رشید کے چچا زاد بھائی کا جب وہ مرض سکتہ میں مبتلا تھا اور دربار کے یونانی عیسائی طبیب نے اس کی موت کا حکم لگا دیا تھا کامیاب علاج کیا عباسی خلفا کے مشہور برمکی وزرا کے شفا خانے کا افسر اعلی بھی ایک ہندوستانی تھا اور وہ دوسرے اطبّا کے ساتھ سنسکرت سے عربی میں کتابیں ترجمہ کرنے پر مامور تھا علم طب کی جو کتابیں سنسکرت سے عربی میں منتقل ہوئیں ان میں سسٹرت اور چرک کی کتابیں خاص طور پر قابل ذکر ہیں دو کتابیں جڑی بوٹیوں کے متعلق تھیں ایک ہندو پنڈتانی کی لکھی ہوئی ایک کتاب کا ترجمہ ہوا جس میں عورتوں کی بیماریوں کے علاج درج تھے زہروں کے ثرات اور ان کی پہچان کے متعلق بھی کتابیں ترجمہ ہوئیں جانوروں کے علاج میں چانکیہ پنڈت کی کتاب بھی عربی میں منتقل ہوئی عربوں نے ہند علم طب سے جس طرح فیض حاصل کیا اس کے اثرات بعض دواؤں کے ناموں میں دیکھے جا سکتے ہیں مثلاً مشہور دوا اطریفل (تری پھل یعنی پھلوں کا مرکب) ہے۔ عود ہندی۔ قسط ہندی۔ تمر ہندی۔ بھی ان ہی اثرات کی یادگار ہیں۔

حکمت و دانش کی بھی کئی کتابیں سنسکرت سے عربی میں ترجمہ ہوئیں ان میں سے کلیلہ و دمنہ اور بوذاسف و بلوہر دنیا کی اہم ترین کتابوں میں سے ہیں کلیلہ و دمنہ پنج تنتر کا ترجمہ ہے پہلے یہ کتاب سنسکرت سے فارسی میں ساسانیوں کے عہد حکومت میں منتقل ہوئی پھر دوسری صدی ہجری میں عبداللہ بن المقفع نے اسے عربی میں ترجمہ کیا اصل فارسی ترجمہ تو کھو گیا لیکن عربی ترجمہ سلامت رہا اور یہ کتاب اس قدر مقبول ہوئی کہ نظم اور نثر میں کئی دفعہ منتقل ہوئی اور پھر عربی سے دنیا کی سب سے مہذب زبانوں میں اس کے ترجمے ہوئے، بوذاسف و بلوہر کو کلیلہ و دمنہ کی سی عام شہرت حاصل نہیں ہوئی لیکن اس کی اہمیت اور بلندی کلیلہ و دمنہ سے بڑھ کر ہے یہ کتاب گوتم بدھ کی پیدائش، تربیت اور حکایات و تمثیلوں کے پیرائے میں ایک جوگی سے دنیا کے سربستہ رازوں پر اس کی گفتگو کا بیان ہے

مذہبی حلقوں میں یہ کتاب اس قدر مقبول ہوئی کہ عیسائیوں نے اس کو اپنے ایک مذہبی عالم سے منسوب کیا اور مسلمانوں کے ایک فرقہ نے اسے اپنے امام کی تصنیف بتایا رسائل اخوان الصفا میں جو چوتھی صدی کی نیم مذہبی اور نیم فلسفیانہ تصنیف ہے اس کتاب کے کئی ابواب ہیں۔

ان کے علاوہ اور کئی کتابیں ہندوستان سے عرب پہنچیں بعض قصہ کہانیوں کی تھیں بعض ہندوستان کے جادومنتر، کیمیا اور علم جوتش کے متعلق تھیں مہابھارت کا خلاصہ بھی عربی میں مرتب ہوا۔ دو کتابیں شناق (چانکیہ) اور دیا گھر کی علم حکومت اور فنون جنگ کے متعلق تھیں تیسری کتاب کا ترجمہ ادب الملک کے نام سے مرتب ہوا۔

ان تعلقات کے علاوہ بعض مستشرقین کا خیال ہے کہ اسلام میں تصوف کا آغاز بھی ہندوستانی اثرات کی وجہ سے ہوا بنی امیہ کے زمانے میں کئی ہندوستانی بصرے کے دفتر خزانہ میں ملازم تھے خلیفہ معاویہؓ کی نسبت کہا جاتا ہے کہ انھوں نے ملک شام میں انطاکیہ کے نزدیک اور حجاج نے کاشغر کے قریب بہت سے ہندوستانی آباد کئے پروفیسر نکلسن لکھتے ہیں ''خلفا کے علاقوں میں سیاہ چشم ہندو اور مسلمان ایک ساتھ رہتے تھے اسلامی حکومت کے مشرقی حصے یعنی خراسان۔ افغانستان سبستان اور بلوچستان کے لوگ مسلمان ہونے سے پہلے ہندو مذہب یا بدھ مت کے پیرو تھے بلخ میں بدھ مت کا ایک بہت بڑا عبادت خانہ تھا جس کے مہتمم کا نام برمک تھا عباسیہ خاندان کے مشہور وزراء اسی برمک کی اولاد سے تھے''۔

عربوں نے بدھ مت کی کئی کتابوں کا ترجمہ کیا۔ عرب مصنفین (مثلا الندیم الاشعری شہرستانی) کی تصانیف میں ہندوستانی مذاہب اور فلسفہ کے متعلق مستقل ابواب ہیں۔ ان کے علاوہ اس زمانے کے اسلامی لٹریچر میں بدھ سادھوؤں اور یوگیوں کا ذکر بالوضاحت ملتا ہے۔ ان تعلقات کی بنا پر بعض یورپین مستشرقین کی رائے ہے کہ ان ہندوستانی اثرات کے راستے کئی خیالات جن کا سراغ قرآن مجید یا احادیث یا سیرت نبوی میں نہیں ملتا۔ تصوف میں داخل ہو گئے۔ (۱)

## مذہبی حالت

سندھ میں عربوں کی حکومت دیر تک برقرار رہی اور بعض شہروں میں ان کی نو آبادیاں قائم ہو گئیں جن میں عالم فاضل لوگ بھی تھے، لیکن قرائن سے خیال ہوتا ہے کہ انھوں نے عوام میں اشاعت

(۱) مرجع سابق، ص:۳۱-۳۵۔

اسلام کی کوئی منظّم کوشش نہ کی اور سندھ کی بیشتر آبادی کا تبدیل مذہب آہستہ آہستہ اور کئی تدریجی منزلوں سے گزرنے کے بعد ہوا، معاصرانہ تواریخ سے خیال ہوتا ہے کہ دیبل اور دوسری جگہوں پر جہاں عربوں کی آبادیاں تھیں، علماء کی کمی نہ تھی قاضی عبدالکریم سمعانی (المتوفی ۵۶۲ھ) نے محدثین کا ذکر کیا ہے، جو دیبل میں گزرے ہیں، اپنی مشہور کتاب الانساب میں اپنے معاصرین اور متقدمین کا شہروں اور علاقوں کے انتساب سے ذکر کیا ہے، اس میں دیگر ممالک کی طرح ہندوستان کا بھی ذکر ہے، اور سندھ، دیبل، مصورہ اور لاہور کے کئی بزرگوں کے مختصر حالات درج ہیں، مثلاً ابومعشر نجیح سندھ، جو نومسلم تھے اور مدینہ منورہ میں مدت تک رہنے کی وجہ سے مدنی کہے جاتے تھے، اپنے زمانے میں فن مغازی وسیر کے امام تھے بلکہ مورخین آپ کو ان بزرگوں کی فہرست میں شامل کرتے ہیں، جو فن سیر ومغازی کو اولاً قید تحریر میں لائے آپ کی وفات ۱۷۰ھ میں ہوئی اور آپ کی شہرت کا یہ عالم تھا کہ آپ کی نمازِ جنازہ خلیفہ ہارون رشید نے پڑھائی۔

دوسرے نومسلم محدث رجاء السندھی تھے، جو (ایران میں قیام کی وجہ سے؟) اسفرائنی کہلانے لگے انھیں بعض بزرگوں نے ''رکن من ارکان الحدیث'' لکھا ہے، ۲۲۱ھ میں وفات پائی ان کے بیٹے بھی بڑے ممتاز محدث تھے اور بغداد میں درس دیا کرتے تھے۔

معلوم ہوتا ہے، سندھ میں علم حدیث سے دلچسپی شروع سے تھی، چنانچہ بیت المقدس کے عرب سیاح عالم ابوالقاسم جو سلطان محمود کی فتوحات سے پچیس سال پہلے سندھ میں آئے تھے، اہل سندھ کی نسبت لکھتے ہیں: '' و اکثرھم اصحاب حدیث ''، علامہ سمعانی نے متعدد محدثین اور علما کا ذکر کیا ہے، جو سندھ کے مختلف شہروں میں تھے، ان کے علاوہ ایک عربی سندھی شاعر ابوعطا سندھی کا نام بھی ملتا ہے، جس کے عربی اشعار کے اہل عرب معترف تھے، بایزید بسطامیؒ کے حالات سے پتا چلتا ہے کہ ان کا ایک استاذ ابوعلی سندھی تھا نفحات الانس میں مولانا جامی نے شرح شطحیات شیخ روزبھان بقلی کے حوالے سے لکھا ہے ''بایزید گوید مدمن از ابوعلی علم فنا وتوحید آموختم وابوعلی از من الحمد و **قُل هُو اللّٰهُ اَحَد**؛ لیکن اگرچہ یہ تعلق تصوف کی تاریخ میں بڑا اہم ہے، (اور مولانا جامی نے نفحات الانس میں ہندوپاکستان کے فقط چھ سات صوفیہ کا ذکر کرنے کے باوجود ابوعلی سندھی کا ذکر ضروری سمجھا ہے) لیکن اس مختصر بیان کے علاوہ ابوعلی سندھی کی نسبت کوئی دوسری طلاع نہیں ملتی۔

ایک عرب سیاح مقدسی نے اپنے سفر نامہ میں منصورہ کے تعلق لکھا تھا:

''میں نے یہاں قاضی ابومحمد منصوری کو دیکھا جو داؤدی (امام داؤد

ظاہری کے پیرو) تھے اور اپنے مذہب کے امام ہیں اور ان کی بہت سی
اچھی تصنیفات ہیں'' مقدسی نے سندھی مسلمانوں کی تعریف کی
ہے:،ان کے ہاں اسلام کو تازگی حاصل ہے اور علم اور اہل علم یہاں
بہت ہیں''۔

غالباً یہ بیان عرب آبادکاروں کے متعلق ہوگا، کیونکہ یہی سیاح آگے چل کر لکھتا ہے:''اہل ذمہ بت پوجتے ہیں، مسلمانوں میں واعظوں کا وجود نہیں'' شاید اس کا مطلب یہ ہے کہ مسلمان مبلغ اہل ذمہ میں جا کر وعظ کرنے والا کوئی نہ تھا، ورنہ جس جگہ اہل علم کثرت سے ہوں، وہاں خطیب اور مسلمانوں کی ضروریات پوری کرنے والے واعظ تو ضرور ہوں گے، منصورہ کی قابل ذکر ہستیوں میں ایک عرب نوجوان کا بھی بیان آتا ہے، جس نے الور (روہڑی) کے ہندو راجا کی استدعا پر قرآن مجید کا سندھی زبان میں ترجمہ کیا تھا، مقدسی نے سندھ کے دوسرے شہروں کی نسبت جو واقعات بیان کیے ہیں، ان سے پتا چلتا ہے کہ منصورہ کے باہر علم وفضل کو وہ رونق نہ تھی جو سندھ کے اس قدیمی دارالخلافہ کو تھی، جہاں عرب کثرت سے موجود تھے، مثلاً مکران کے مستقر الحکومت کی نسبت مقدسی کا بیان ہے:

''جو لوگ بازاروں میں چلتے پھرتے ہیں، صرف برائے نام مسلمان
ہیں، کیونکہ ان میں مسلمانوں کی سی کوئی بات نہیں، زبان یہاں کی
بلوچی ہے......اچھی اچھی کارواں سرائیں ہیں اور جامع مسجد بھی
اچھی ہے، مگر عام علم وفضل یہاں کے لوگوں میں نہیں''۔

اس کے علاوہ سندھ میں بھی ان نیم سیاسی مذہبی اختلافات کا پرتو پڑتا تھا، جنھوں نے ممالک عرب وایران ومصر کو اسماعیلی، عباسی کشمکش کی وجہ سے ایک کارزار بنا رکھا تھا، مثلاً اگرچہ مقدسی لکھتا ہے کہ علاقہ ملتان میں امام ابوحنیفہ کے مقلد کثرت سے تھے اور مختلف فرقوں میں کوئی جھگڑا نہ تھا، لیکن صاف نظر آتا ہے کہ اس زمانے میں (۳۷۵ھ کے قریب) اس علاقے پر اسماعیلی اثرات پوری طرح غالب آچکے تھے۔

''اہل ملتان شیعہ ہیں، اذان میں حی علی خیر العمل کہتے ہیں اور تکبیر دو دفعہ کہتے ہیں ......اور ملتان والوں کا سکہ (مصر کے اسمٰعیلی) فاطمیوں کے مثل ہے، ملتان میں خلفائے بنی فاطمہ کا خطبہ جاری ہے اور یہاں کوئی حکم بغیر ارض مصر کے فاطمی خلیفوں کی منظوری کے اجرا نہیں پاتا، اہل ملتان کے ہدایا اور قاصد برابر مصر میں آتے جاتے رہتے ہیں اور مصر کے اسماعیلیوں کا یہاں اس قدر زور

ہے کہ بغیر ان کی اجازت کے یہاں کوئی شخص ملتان کے تخت پر نہیں بیٹھ سکتا۔''

مقدسی کے بیان سے خیال ہوتا ہے کہ اس کے سفر کے زمانے میں عرب آباد کاروں کی مذہبی حالت اچھی تھی، لیکن جہاں تک مقامی باشندوں کا تعلق ہے، ان کی روحانی زندگی میں صدیوں تک ایک عجیب کھلبلی مچی رہی۔ فتوح البلدان میں لکھا ہے کہ فتح سندھ کے جلد بعد خلیفہ عمر بن عبدالعزیز کے زمانۂ خلافت میں سندھ کے بعض قبیلے دائرۂ اسلام میں آئے لیکن اسی کتاب میں لکھا ہے کہ اس کے چند سال بعد کتنے ہی قبیلے اسلام سے منحرف ہو گئے اس کے بعد سندھ اسمٰعیلی اور قرمطی مبلغوں کا بازی گاہ بنا رہا اور مسعودی کے زمانۂ سفر میں ہی یہ لوگ ملتان اور مکران پر چھائے ہوئے تھے، اس زمانے میں تبلیغ کے لئے سب سے زیادہ منظّم اور باقاعدہ کوششیں ان ہی لوگوں نے کیں اور ان کے مخلوط مذہبی نظام نے سندھ کے قدیمی مذہب اور اسلام کے درمیان ایک پل کا کام دیا، ان لوگوں کی کوششوں اور عام روحانی بدنظمی سے جو حالت پیدا ہوگئی تھی، اس کا اندازہ سومرہ خاندان کے حالات دیکھ کر ہو سکتا ہے، جن کے نام ہندوانہ تھے اور مذہب کی نسبت یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا، سمہ خاندان کے زمانے میں اسلامی اثرات غالب آگئے تھے، لیکن اس کے بعض حکمرانوں کے نام بھی ہندوانہ تھے اور یقیناً ان کے رسم و رواج میں بھی کئی باتیں ہندوؤں کی باقی رہ گئی ہوں گی کہ سمہ خاندان کی ڈیڑھ سو سال کی حکومت کے بعد یہ حالت تھی کہ جب ۱۴۷۲ء میں احمد آباد کے حاکم سلطان محمود بیگڑہ نے سندھ پر حملہ کیا تو اس وقت بھی کئی سندھی مسلمان برائے نام مسلمان تھے۔ چنانچہ بادشاہ ان کے کئی سرداروں کو جونا گڑھ لے گیا اور انھیں مسلمانوں کے سپرد کیا تاکہ وہ انھیں مذہب حنفیہ کے مطابق سنت نبوی کا طریقہ سکھائیں۔(۱)

## ساحل ہند پر عربوں کی بستیاں

**نوائط:** محمد بن قاسم کی مہم، جس نے سندھ کی فتح کا سامان کر دیا، حجاج بن یوسف کے انتقامی جوش کا نتیجہ تھی اور یہ عجیب اتفاق ہے کہ جنوبی ہندوستان کے ساحلوں پر عرب مسلمانوں کی سب سے قدیم نوآبادیاں بھی حجاج کی بدولت وجود میں آئیں۔ اگرچہ اس میں حجاج کی کوشش بلکہ خواہش کو دخل نہ تھا، حجاج امویوں کا ملازم تھا اور ہاشمیوں کا بدترین دشمن، مشہور ہے کہ اس پچاس ہزار افراد کو جو فریق مخالف کے طرف دار تھے، تیغِ ظلم و ستم کا شکار بنایا۔ چنانچہ جہاں کہیں وہ جاتا، بنی

(۱) مرجع سابق، ص: ۳۵-۳۹۔

ہاشم کے طرف دار ترک وطن پر مجبور ہوجاتے جب وہ عراق کا گورنر ہوا تو ہاشمیوں کی ایک بڑی جماعت یہ علاقہ چھوڑ کر ہندوستان آ گئی۔ ان میں سے جو لوگ مغربی ساحل (بالخصوص کونکن کے کنارے) پر آباد ہوئے ان کی اولاد کو نوائت (نووارد) یا نوائط، اور جو لوگ راس کماری کے مشرق میں آباد ہوئے، اور یہاں کی تامل عورتوں سے شادی کر کے ایک مخلوط قوم کے بانی ہوئے، انہیں لبّی (Labbes) کہتے ہیں۔ چونکہ اس زمانے میں ہندو جہاز رانی کو پاپ سمجھتے تھے، اس لئے ان لوگوں نے جہاز رانی اور تجارت سے اپنے نئے وطن میں عزت ووقار حاصل کرلیا۔ اب بھی ساحلی علاقوں کے مسلمانوں میں ان لوگوں کی کثرت ہے۔ صوبہ ممبئی کے کونکن مسلمان جو اپنے تئیں نوائط کی اولاد بتاتے ہیں بڑے اچھے جہاز ران ہوتے ہیں اور دکن کے ساحل پر نوائط تاجروں کی اچھی آبادیاں ہیں، نوائط بالعموم شافعی مذہب کے پیرو ہیں اور ان میں سے کئی بڑے عالم پیدا ہوئے ہیں، بالخصوص مخدوم علی مہائمی جن کا مزار ممبئی کے قریب قصبہ مہائم میں ہے۔ ہندوستان کے سب سے بڑے علماء کے ساتھ جگہ پانے کے مستحق ہیں۔ (۱)

## سری لنکا

ان لوگوں کے علاوہ جو حجاج کے خوف سے یا بعد میں قرمطیوں اور اسمٰعیلیوں کے مذہبی احتساب سے بچنے کے لئے ہندوستان کے ساحلی مقامات پر پناہ گزین ہوئے، عرب اور ایرانی تاجر کثرت سے ان جگہوں میں آتے رہے۔ نقل مکان کا یہ سلسلہ ظہور اسلام سے پہلے ہی قائم تھا اور جب عرب اور ایران میں اسلام پھیل گیا تب بھی برقرار رہا، لنکا میں تو مسلمانوں کے نشانات ہندوستان سے بھی پہلے ملتے ہیں۔ چنانچہ ہم سندھ کی مہم کے ضمن میں کہہ چکے ہیں کہ عربوں اور سندھ کے راجا کے درمیان وجہ مخاصمت یہ تھی کہ سندھ کے بحری ڈاکوؤں نے ان جہازوں کو لوٹ لیا تھا، جن میں لنکا سے آنے والے مسلمان مرد، عورتیں اور بچے سوار تھے۔

قدیم عربی کتاب عجائب الہند میں لنکا کی نسبت لکھا ہے کہ جب یہاں کے رہنے والوں کو رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا حال معلوم ہوا تو انھوں نے ایک سمجھ دار آدمی تحقیق حالات کے لیے بھیجا۔ جب وہ مدینہ منورہ پہنچا تو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بلکہ حضرت ابوبکر صدیقؓ بھی وصال پا گئے تھے اور حضرت عمرؓ کا زمانہ تھا۔ انہوں نے متجسس حالات سے تمام باتیں تفصیل سے کہیں اور وہ

(۱) مرجع سابق، ص: ۴۱-۴۲۔

اپنی تشفی کے بعد ہندوستان کی طرف واپس پھرا، راستے میں وہ تو مر گیا، لیکن اس کا ایک ہندو ونوکر صحیح سلامت لنکا واپس پہنچ گیا۔ اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کا سارا حال بیان کیا۔ اور ان کے فقیرانہ اور درویشانہ طور وطریق کا ذکر کیا اور بتایا کہ وہ کیسے متواضع اور خاکسار ہیں اور پیوند لگے ہوئے کپڑے پہنتے ہیں اور مسجد میں سوتے ہیں۔ یہ باتیں لنکا والوں کو پسند آئیں اور مسلمانوں کے ساتھ ان کی محبت بڑھ گئی۔

چنانچہ عجائب الہند کا راوی لکھتا ہے:

''اب یہ لوگ مسلمان کے ساتھ جو اس قدر محبت اور میلان رکھتے ہیں وہ اسی سبب سے ہے''۔(۱)

## شرق الہند میں اشاعت اسلام

اسی زمانے میں اسلام نے جاوا سماٹرا اور ملایا میں فروغ حاصل کیا، ہالینڈ کے مستشرقین کا خیال ہے کہ ان ممالک میں عربوں نے نہیں بلکہ ان مسلمانوں نے جو شاید عرب نسل سے تھے، لیکن ہندوستان میں بس چکے تھے، اشاعت اسلام کی عجب نہیں کہ جب وجے نگر نے معبر کی اسلامی حکومت کا خاتمہ کیا اور مسلمانوں پر ظلم وستم کا آغاز کیا تو بعض مسلمان ترکِ سکونت کر کے جزائر شرق الہند میں جا بسے ہوں اور وہاں اسلام کی ترقی اور رونق کا باعث بن گئے ہوں۔

ملایا، جاوا اور دوسرے علاقوں میں جو شواہد ملتے ہیں، ان سے گجرات، مالا بار اور معبر ہی نہیں بلکہ بنگالہ کے ان علاقوں سے تعلقات پر روشنی پڑتی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ جنوبی ایشیا کے تمام ساحلی علاقے کشتیوں اور بادبانی جہازوں کی آمد ورفت سے منسلک تھے، جن کے کشتی بان ہی نہیں بلکہ تجارت پیشہ مسافر بھی مسلمان تھے، اس کی وجہ سے نہ صرف ان علاقوں میں تجارتی بلکہ ثقافتی اور دینی تعلقات قائم ہوئے اور جزائر شرق الہند میں اسلام کی اشاعت کا سامان ہوا۔

غالبًا گجرات، مالا بار اور معبر کی طرح چٹا گانگ کے پاس (موجودہ مشرقی پاکستان میں) مسلمانوں کی بستیاں تھیں، چٹا گانگ کے گرد ونواح اور قریبی جزائر (مثلاً سندیپ) میں بنگالی کی جو صورت رائج ہے، اس میں عربی اثرات خاص طور پر نمایاں ہیں، اس علاقے عربی رسم الخط کو بنگال کے باقی حصوں سے زیادہ اہمیت رہی ہے۔ یہاں قدیم بنگالی کتابوں (مثلاً علاول کی تصانیف) کے

(۱) مرجع سابق، ص:۴۲-۴۳۔

جومخطوطے دستیاب ہوئے ہیں، ان میں کئی عربی رسم الخط میں ہیں، (یہ محض اتفاق نہ تھا کہ بنگالی کو حروف قرآن میں لکھنے کی جوتحریک ایک زمانے میں شروع ہوئی تھی اس کا مرکز چٹا گانگ تھا) یہ عربی اثرات یقیناً عرب تاجروں اور ملاحوں کی آمد ورفت کا نتیجہ تھے اوراس ساحل پر عربوں کی مقامی نوآبادیاں قرین قیاس معلوم ہوتی ہیں، لیکن افسوس کہ تاریخ ان کے متعلق خاموش ہے۔ اس علاقے میں عربوں کی آمد کا سب سے پہلا سراغ برما کے علاقے اراکان کی مقامی تواریخ میں ملتا ہے۔ جن سے پتا چلتا ہے کہ وہاں کے ایک راجا کے عہد حکومت میں (جو ۷۸۱ء میں تخت نشین ہوا) عربوں کے کئی جہاز سمندر میں طغیانی کی وجہ سے رمری کے قریب (جو چٹا گانگ سے چودہ میل جنوب میں ہے) ٹوٹ پھوٹ گئے اور مسافروں کو اراکان کے اندرونی علاقے میں بسایا گیا۔ بعد میں اراکان کے ساحل پر اسلامی اثرات بہت بڑھ گئے۔ چنانچہ کیمبرج ہسٹری میں لکھا ہے کہ تیرھویں صدی میں آسام سے ملایا تک کے ساحل پر جابجا مسجد نما عمارتیں تھیں، جنھیں بدر مکان (یا بدر مقام) کہا جاتا تھا۔ ہاروے نے وضاحت کی ہے کہ ان عمارتوں کو نہ صرف مسلمان بلکہ چینی اور بدھ مت کے پیرو بھی احترام سے دیکھتے۔ ان کا انتساب بدر اولیا یا بدرالدین اولیا سے تھا، جن کا چٹا گانگ میں چلہ خانہ بتایا جاتا ہے، لیکن جو بہار میں دفن ہیں اور جن کے ملاح اور کشتی بان خاص طور پر معتقد تھے۔[۱]

## سندھ میں اشاعت اسلام

**سیاسی حالات:** ہم ذکر کر چکے ہیں کہ سندھ میں عرب حکومت کے کمزور ہوجانے پر شمالی سندھ میں ملتان اور جنوبی سندھ میں منصورہ دو خودمختار ریاستیں قائم ہوئیں، جن پر ایک زمانے میں قرامطہ قابض ہوگئے، سلطان محمود غزنوی نے انھیں شکست دے کہ یہ مقامات اپنی سلطنت میں شامل کر لیے، لیکن جب وہ ان دور افتادہ مقامات پر اپنا ضبط قائم نہ رکھ سکے تو قرمطیوں نے پھر سر اٹھایا اور سلطان محمد غوری کو از سر نو انہیں زیر کرنا پڑا، اس کے بعد کچھ دیر تک سندھ حکومت دہلی کے ماتحت رہا۔ صوبیدار کا صدر مقام ملتان تھا اور وہ مغربی پنجاب اور سندھ کا حکمران ہوتا تھا، ملتان کے تین صوبیدار ناصرالدین قباچہ، خان شہید ابن غیاث الدین لبن اور غازی ملک المعروف غیاث الدین تغلق تاریخ میں خاص طور پر مشہور ہیں۔

اس زمانے میں سندھ کے بعض حصوں کو ایک حد تک خودمختاری حاصل تھی اور کئی چھوٹی چھوٹی

(۱) مرجع سابق، ص:۵۲-۵۳۔

ریاستیں، جن میں سے بعض ہندوراجاؤں کے تابع تھیں، دہلی اور ملتان کے منتظم اور بااثر حاکموں کی تو اطاعت کرتیں، لیکن جب موقع ملتا، خودمختاری کا رنگ اختیار کرلیتیں، ان حکمرانوں میں سے ٹھٹھ ناسومرہ خاندان خاص طور پر مشہور ہے، جس کا اثر اور اقتدار کسی نہ کسی صورت میں صدیوں تک برقرار رہا۔ ان لوگوں کا دعویٰ تھا کہ وہ عراق کے شہر سامرہ سے حجاج بن یوسف کے عہد میں آئے تھے۔ لیکن ان لوگوں کے نام ہندوانہ تھے، انگریز مورخین کی رائے ہے کہ وہ اصل میں راجپوت تھے اور مسلمانوں اور عربوں میں اپنا اثر بڑھانے کے لیے اپنے حسب ونسب کے متعلق غلط دعوے کرتے تھے، سید سلیمان ندوی کا خیال ہے کہ وہ ''عربی ہند ومخلوط تھے''۔ اسماعیلی مذہب کے پیرو تھے اور جس طرح قرمطی اور اسماعیلی اسلامی عقائد کے ساتھ ہر جگہ کے کچھ مقامی مراسم اور اعتقادات کو شامل کرلیتے تھے، تبلیغ میں آسانی کے لیے ان لوگوں نے بھی یہی کیا تھا، اس لئے ان میں ہندوانہ نام اور رسمیں آگئی تھیں، دونوں رائیں قیاس پر مبنی ہیں، اتنا یقینی ہے کہ سومری صحیح طور پر عرب سنی مسلمان نہ تھے، ان کے نام اور کئی رسمیں ہندوانہ تھیں۔

محمد تغلق کے زمانے میں شاہ دہلی اور سومریوں میں کشمکش شروع ہوئی اور اس دوران میں جنوبی سندھ کی حکومت سومریوں سے نکل کر سمہ قوم کے ہاتھ میں آگئی۔ اس موقع پر فرشتہ لکھتا ہے ''درآخر عہد شاہ محمد تغلق شاہ بسعی وامداد مسلمانان دولت از خاندان طبقہ سومرگان بفرقہ سمگان منتقل شد واکثر حکام ایشاں بدولت اسلام اختصاص داشتند'' اس سے خیال ہوتا ہے کہ سومری صحیح طور پر مسلمان نہ تھے بلکہ سمہ قبیلے کے سارے حکام بھی دولت اسلام سے شرف یاب نہ تھے۔

سمہ خاندان سے سلطان فیروز شاہ تغلق کی چپقلش ہوئی، شروع میں تو بادشاہ کو کامیابی نہ ہوئی اور اسے گجرات ناکام واپس جانا پڑا، لیکن اگلے سال وہ زیادہ فوج کے ساتھ حملہ آور ہوا، سمہ سردار نے کام بگڑتا دیکھا تو حضرت مخدوم جہانیاںؒ کے پاس بمقام اچہ قاصد بھیجا، اور درخواست کی کہ بادشاہ سے مصالحت کرادیں، حضرت مخدوم تشریف لائے اور فریقین میں مناسب شرائط پر صلح کرادی۔ ان شرائط میں سے ایک یہ تھی کہ سمہ سردار (تماچی) اور دوسرے امرا فیروز تغلق کے ساتھ دہلی جائیں گے اور وہاں رہیں گے۔ اس خاندان کے پہلے تین سرداروں کے نام ہندوانہ ہیں (جام اونر، جام جونا، جام تماچی) فرشتہ نے اس سے قیاس کیا ہے کہ پہلے تین سردار ہندو تھے اور بعد کے مسلمان ہوئے۔

سید سلیمان ندوی کا خیال ہے کہ یہ لوگ شروع میں اپنا قومی نام رکھتے تھے، بعد میں سلاطین دہلی کی پیروی میں عربی القاب اختیار کرنے لگے، لیکن سلطنت پانے سے پہلے ہی سب مسلمان ہوگئے

تھے، سندھ گزٹیئر کے مصنف کا خیال ہے کہ علاقہ کچھ کے جادیجہ راجپوتوں کی طرح جو سمہ لوگوں کے ہم قوم تھے (اور جن کی نسبت ان کے راجا کا بیان ہے کہ دو ہزار جادیجوں میں سے تین کو بھی پتا نہیں کہ ان کا مذہب کیا ہے؟) یہ لوگ بھی ایک عرصہ تک مخلوط مذہب کے پیرو ہوں گے اور پھر مسلمان ہوگئے، چوتھا (یا ایک ترتیب سے پانچواں) سمہ سردار بچپن میں ہی بطور یرغمال دہلی گیا تھا، اس کا نام تاریخ میں خیرالدین درج ہے، وہ دہلی کی اسلامی فضا سے متاثر ہوا اور قرین قیاس ہے کہ اپنے عہد حکومت میں اس نے اپنی قوم کو ایک ڈھب پر لانے کی کوشش کی ہوگی، سمہ لوگوں کی حکومت سندھ میں دیر تک رہی اور ٹھٹھ کے علاوہ ایک وقت بھکر اور سہوان تک کا سب علاقہ ان کے قبضے میں تھا۔

سمہ خاندان کا سب سے بڑا حاکم جام نظام الدین عرف جام نندا تھا، جس نے ساٹھ سال حکومت کی اور موجودہ شہر ٹھٹھہ کی بنیاد ڈالی، اس کے پیشرو جام سنجر کا ایک دلچسپ قصہ بیان کرتے ہیں، جو معاصرانہ حالات اور سندھی حکام کی قدیمی روش پر روشنی ڈالتا ہے، ایک دفعہ جام سنجر نے سنا کہ شہر بھکّر کا قاضی (قاضی معروف) مقدمات فیصل کرنے کے وقت مدعی اور مدعا علیہ دونوں سے رشوت لیتا ہے، جام نے اسے بلا بھیجا اور استفسار کیا، قاضی نے کہا کہ یہ ٹھیک ہے کہ میں دونوں فریقوں سے کچھ نہ کچھ لیتا ہوں اور میرا تو جی چاہتا ہے کہ گواہوں سے بھی کچھ وصول کروں۔ لیکن وہ مقدمہ ختم ہونے سے پہلے ہی چلے جاتے ہیں۔ جام یہ سن کر ہنسا، اس پر قاضی نے کہا کہ اس کے باوجود یہ حال ہے کہ میں تو سارا دن مقدمات میں سر کھپاتا ہوں اور گھر پر میرے بیوی بچے بھوکے مرتے ہیں، جام نے یہ سن کر سمجھ لیا کہ سرکاری عمال کو بہت تھوڑی تنخواہ دینا غلطی ہے اور قاضی کے مشاہرے میں اضافہ کر دیا۔

سمہ حکومت کے اختتام کے بعد تھوڑا عرصہ سندھ ارغون اور ترخان ترکوں کے قبضے میں رہا اور بالآخر ۱۵۹۲ء میں اکبر نے مرزا جانی بیگ کو شکست دے کر سندھ کو پھر حکومت دہلی کا باجگزار صوبہ بنا دیا۔[1]

## مخدوم لال شہباز قلندرؒ

مشہور اولیاء میں سے سب سے پہلے شیخ بہاء الدین زکریاؒ نے سندھ کی طرف توجہ کی، تحفۃ الکرام میں لکھا ہے:

(۱) مرجع سابق، ص: ۲۹۰-۲۹۳۔

''اہلِ سندھ اغلب از مریدانِ آں درآمدہ واول کسے کہ از مشائخ
سلسلہ ارشاد در جنبانیدہ اوست''۔

ان کا ذکر ہم کسی قدر تفصیل سے کر چکے ہیں، ان کے ایک پیر بھائی اور شیخ شہاب الدین سہروردیؒ کے مرید، شیخ نوح بھکری ان سے پہلے ہی سندھ میں موجود تھے، وہ بڑے پاک سیرت بزرگ تھے، لیکن ان سے ارشاد و ہدایت کا سلسلہ اتنا وسیع انہیں ہوا جتنا حضرت زکریا ملتانیؒ سے، شیخ بہاء الدین کے مشہور مرید جن کا ذکر ہندوستان کے تذکروں میں علم ملتا ہے اور جن کا مزار سندھ کی سب بڑی زیارت گاہ ہے، مخدوم لال شہباز قلندرؒ ہیں، ان کا وطن تبریز کے قریب ایک گاؤں مرند میں تھا، اصل نام شیخ عثمان تھا، تیرہ سلسلوں سے آپ کا نسب امام جعفر صادق تک پہنچتا ہے جب آپ سنِ بلوغت کے پہنچے تو بابا ابراہیم کی خدمت میں حاضر ہو کر مرید ہوئے اور ایک سال تک ان کی خدمت میں رہے، اس کے بعد خرقۂ خلافت پاکر ہندوستان کا رخ کیا، اور شیخ فریدؒ گنج شکر اور شیخ بہاء الدین زکریاؒ کی خدمت میں حاضر رہ کر فیض یاب ہوئے، شیخ صدر الدین عارفؒ سے آپ کی اکثر صحبت رہتی تھی اور بلبن کا بیٹا خان شہید بھی آپ کا معتقد تھا، ضیاء الدین برنی نے لکھا ہے کہ خان شہید نے بڑی کوشش کی کہ آپ ملتان میں اقامت پذیر ہو جائیں اور اس مقصد کے لیے ایک خانقاہ کی تعمیر بھی شروع کی لیکن آپ نہ مانے۔ البتہ آپ گاہے گاہے خان شہید کی محفل میں جاتے تھے اور شیخ صدر الدین عارف کے ساتھ سماع و رقص میں حصہ لیتے تھے۔

تحفۃ الکرام میں لکھا ہے کہ آپ پھرتے پھراتے حضرت بوعلی قلندرؒ کی خدمت میں پہنچے، لیکن انہوں نے کہا کہ ہندوستان میں تین سو قلندر ہیں۔ بہتر ہے کہ آپ سندھ میں ہی تشریف لے جائیں۔ چنانچہ شیخ سندھ میں آکر سیوستان میں مقیم ہوئے اور یہاں آپ کو بڑی مقبولیت حاصل ہوئی، آپ کو مرشد نے شہباز کا خطاب دیا تھا، چونکہ آپ اکثر سرخ لباس پہنتے تھے، اس لیے آپ کو لال شہباز کہتے تھے، آپ اہل علم اور شروع میں شرع کے پابند تھے لیکن قلندری مشرب اختیار کرنے کے بعد بالکل آزاد ہو گئے، اور جذب و سکر کی حالت میں رہنے لگے، آپ کے طریقے کے قلندروں کو لال شہباز یہ کہتے ہیں آپ کی وفات ۶۷۳ھ ۱۲۷۴ء میں ہوئی۔ اور سلطان فیروز شاہ تغلق کے عہد حکومت میں ملک اختیار الدین والی سیوستان نے مزار پر ایک شاندار روضہ تعمیر کرایا۔ (۱)

(۱) مرجع سابق، ص: ۲۹۳-۲۹۵۔

## سندھ میں توسیع اسلام

مخدوم لال شہباز کے ایک دو ہم عصر بزرگوں (مثلاً پیر منگھو یا مگر پیر) کے نام ملتے ہیں۔اور چند ایک ایسے مشائخ کے مزار بھی سندھ میں موجود ہیں جو حضرت لال شہباز سے دو ایک صدیاں بعد مقبول عوام تھے،لیکن آج کل سندھ میں پیروں کے جو مشہور سلسلے ہیں،ان کا آغاز مغل بادشاہ بابر کے کے زمانے سے اور بعض صورتوں میں اس سے بھی بعد ہوا،سندھ گزٹیئر کے مصنف کا خیال ہے کہ سندھ میں مسلمانوں کو اکثریت گزشتہ دو تین صدیوں میں حاصل ہوئی ہے۔وہ کیپٹن الیگزینڈر ہملٹن کا بیان نقل کرتا ہے،جس نے ۱۶۹۹ء میں شہر ٹھٹھہ دیکھا اور وہاں ہندوؤں اور مسلمانوں میں دس اور ایک کی نسبت پائی،بیسویں صدی کے آغاز میں حالت بالکل مختلف ہوگئی تھی،سندھ گزٹیئر کے مصنف کا خیال ہے کہ اس تبدیلی میں بالائی سندھ کے ان خاندانوں (کلہورا-تالپور) کی پالیسی کو دخل ہے، جو مغلیہ سلطنت کے زوال کے بعد سندھ میں برسر اقتدار ہوئے اور جنہوں نے زریں سندھ کے ان شہروں اور علاقوں پر، جہاں ابھی تک ہندو اثرات غالب تھے، قبضہ جما لیا،اس کے علاوہ بلوچ قوم کے عروج نے بھی ان اسلامی رجحانات کو ترقی دی، کیپٹن ہملٹن کے زمانے میں اگرچہ حکومت مسلمانوں کی تھی،لیکن ہندوؤں کو پوری آزادی حاصل تھی اور وہ اپنے دن اور تہوار اسی دھوم دھام سے مناتے تھے،جس طرح اپنی حکومت کے دوران میں،لیکن تالپور خاندان کے عہد حکومت میں بلوچوں کے عروج سے صورت حالات مختلف ہوگئی۔

سندھ گزٹیئر میں دو ایسے قبیلوں کے نام لکھے ہیں، جو موجودہ زمانے میں مسلمان ہوئے،ایک دھاریچہ قوم کے لوگ ہیں، جو تھوڑا عرصہ ہوا راجپوتانہ سے آ کر مسلمان ہوئے تھے، وہ تحصیل گھوٹکی (ضلع سکھر) میں کاشتکاری کرتے ہیں، دوسرا قبیلہ اندھر کہلاتا ہے، وہ گھوٹکی، شکارپور اور سکھر میں آباد ہیں، کہا جاتا ہے کہ ان کے جنیو (زنار) علاقہ بہاولپور میں پیر موسیٰ نواب کی درگاہ پر جمع ہیں۔

سندھ کے مسلمانوں میں پیر پرستی زوروں پر ہے اور گاہے پیر پرستی کے عجیب وغریب کرشمے ظہور میں آتے ہیں،اس کی نمایاں مثال حُر لوگوں کا نظام ہے، جو پیر پگاڑو (پگڑی والے پیر) کے معتقد ہیں،ان لوگوں کا مرکز روہڑی کے نزدیک کنگری نام کا ایک گاؤں ہے جس میں پیر کا کوٹ آباد تھا،ان لوگوں کا بیان ہے کہ ان کے مرشد کا مورث اعلیٰ پیر شاہ علی مکی،محمدؐ بن قاسم کے ساتھ سندھ آیا اور ایک نومسلم کی بیٹی سے شادی کی،وہ کثیر الاولاد تھا اور اس کے مریدوں کی تعداد بھی

بہت ہوئی ، اس خاندان نے مرور زمانہ سے بڑی وسعت حاصل کر لی ، جانشینی کے سلسلے میں کئی دفعہ دعویداروں میں مخالفت کا بازار گرم ہوا، ایک دفعہ ایک ہنگامے میں پیر صبغت اللہ صاحب (جن کے مولانا سید احمد بریلوی سے گہرے تعلقات تھے ) کے معتقدوں نے عہد کیا کہ وہ سوائے پیر پگاڑو کے یعنی اس پیر کے جسے پیشرو سے دستار خلافت ملی ہو، کسی کے قائل نہ ہوں گے، پیر نے ان راسخ الاعتقاد مریدوں کو حر کا خطاب دیا ان لوگوں نے اپنے مرشدوں کی خوشنودی اوران کے مخالفین بلکہ اس کے اقربا اور خلفا کا قلع قمع کرنے میں انتہائی سرگرمی دکھائی ہے، اوراب سندھ میں ان کا شمار جرائم پیشہ اقوام میں ہوتا ہے ، ان کی روک تھام کے لیے ایک خاص ایکٹ ہے، ان کے ساتھ پولیس کی کئی جھڑپیں ہوئی ہیں اور بعض اوقات تو فوج کی مدد منگائی پڑی ہے، خواجہ حسن نظامی اپنی کتاب فاطمی دعوت اسلامی میں لکھتے ہیں:

حُر فرقے کے ہزاروں آدمی پیر صاحب کو ذات الٰہی کا مظہر اور اوتار سمجھتے ہیں، اگر کوئی شخص پیر صاحب کے برابر بیٹھ جائے یا ان سے مصافہ کر لے تو یہ جاہل لوگ اس کو قتل کر ڈالتے ہیں کیونکہ ان کے عقیدے میں پیر صاحب نور کا ایک پتلا ہیں، اور خاکی انسان جو گناہوں کی پوٹ ہے، اگر پیر صاحب کے قریب بیٹھے یا ان سے ہاتھ ملائے تو نور خدا کی توہین کا ارتکاب کرتا ہے، اس واسطے وہ واجب القتل ہے، حرقوم کے آدمی پیر صاحب کے مکان کے دروازے کا دیدار کر کے چلے جاتے ہیں۔ (۱)

## کشمیر

کشمیر میں اسلام بڑی دیر سے یعنی چودھویں صدی عیسوی کے آغاز میں داخل ہوا سوات کے ایک بزرگ شاہ مرزا ۱۳۱۵ء میں کشمیر کے راجا سنگھ دیو کے ملازم ہوئے اور اپنی خداداد قابلیت سے بڑا اقتدار حاصل کر لیا۔ ان کے بیٹوں کو بھی راجا نے بڑے اختیارات دیئے اور خود ان کو راجا سنگھ دیو کے ایک جانشیں نے اپنا وکیل مطلق مقرر کیا، آخر جب ملک کا نظام درہم برہم ہونے لگا تو ۱۳۴۳ء میں شاہ مرزا صاحب شمس الدین شاہ کے نام سے تخت نشیں ہوئے اور اپنا سکہ اور خطبہ جاری کیا کیمرج ہسٹری میں ان کی نسبت لکھا ہے:

''نئے بادشاہ نے اپنے اختیارات سمجھ اور نیک نیتی سے استعمال کئے
کشمیر کے ہندو راجے بڑے ظالم تھے ان کی علانیہ پالیسی یہ تھی کہ

(۱) مرجع سابق، ص: ۲۹۵-۲۹۷۔

رعیت کے پاس معمولی دال روٹی سے زیادہ کچھ نہ رہنے دیا جائے
نئے بادشاہ کی حکومت لبرل اصولوں پر قائم تھی اس نے بے جا
سرکاری لگان اور غیر منصفانہ ٹیکس ہٹادیئے ٹیکس وصول کرنے کے
ظالمانہ طریقے موقوف کردیئے اور سرکاری لگان پیداوار کے چھٹے
حصے پر مقرر کیا''۔

شاہ میر نے کشمیر سے اسلام کے سیاسی تعلقات کی بنیاد ڈالی۔لیکن اس خطہ جنت نظیر میں اسلام کے پہلے کامیاب مبلغ حضرت بلال شاہ یا بلبل شاہ تھے خزینۃ الاصفیا میں لکھا ہے کہ حضرت بلبل شاہ کا اصلی نام شرف الدین تھا اور اسلام کشمیر میں ان کی بدولت پھیلا۔ وہ شاہ نعمت اللہ فارسی کے مرید اور سہروردی سلسلے کے بزرگ تھے ۱۳۲۴ء میں رنجن شاہ حاکم کشمیر کے عہد میں وہ کشمیر آئے اور راجا اور اس کے بہت سے امرا کو مسلمان کیا تفصیل اس کی اس طرح بیان کی جاتی ہے کہ انھوں نے سرینگر میں آکر شہر کے باہر لب آب قیام کیا۔اس وقت تبتی نسل کے ایک راجا رنجن دیو نے ملک پر قبضہ کرلیا تھا۔ وہ تھا وہ خود بودھ مذہب کا پیرو تھا لیکن اس کی طبیعت اپنے مذہب سے مطمئن نہ تھی ملک میں عام طور پر ہندو مہذہب رائج تھا لیکن اس نے شاہ میر کی وجہ سے جو ابھی ایک بااثر درباری تھا اسلام سے شناسائی حاصل کر لی تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ بودھ مت چھوڑ کر کوئی دوسرا مذہب اختیار کرے بہت سوچ سوچ کر ایک رات اس نے فیصلہ کیا کہ کل علی الصباح سب سے پہلے جو مجھے قابل عظمت اور مقدس ہستی نظر آئے گی میں اسی کا مذہب اختیار کرلوں گا اگلے روز جب وہ اٹھا اور مغرب کی طرف نظر دوڑائی تو دیکھا کہ ایک بزرگ فرشتہ صورت پتھریلی زمین پر بڑے وقار اور خضوع اور خشوع سے نماز ادا کر رہا ہے راجا اسے دیکھ کر بڑا متاثر ہوا پا پیادہ اس کی خدمت میں پہنچا اور اس کے دست حق پرست پر اسلام قبول کیا اس کے بعد اس کے اہل خانہ اور امرائے کبار مسلمان ہوئے، پھر تو لوگ جوق در جوق حضرت بلبل شاہ کی خدمت میں حاضر ہوتے اور دولت اسلام سے فیضیاب ہوتے ،جن لوگوں نے آپ کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا ان کی تعداد دس ہزار بتائی جاتی ہے راجا نے آپ کے ایما پر ایک بڑی خانقاہ کی بنیاد رکھی جواب بھی لنگر بابا بلبل شاہ کے نام سے مشہور ہے اور ایک عظیم الشان مسجد تعمیر کرائی تواریخ اعظمی کے مصنف خواجہ اعظم نے بابا بلبل شاہ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ حق تعالی نے مجھے اتنی طاقت دی ہے کہ میں غذا اور سروسامان کے بغیر خوشی سے زندگی بسر کروں اور اسی بدن کے ساتھ روح کے جدا ہوئے بغیر دارالبقا کو جاؤں اور اس جسم کو ابدالاباد تک محفوظ رکھوں لیکن چونکہ یہ سب امور سنت

نبویؐ کے خلاف ہیں میں ان کا مرتکب نہیں ہوتا سنت کی پیروی میرے نزدیک ہزار سال کی عبادت سے بہتر ہے حضرت کی وفات ۱۳۲۶ء میں ہوئی اس کے ڈھائی سال بعد رنجن شاہ جس نے سلطان صدرالدین کا لقب اختیار کیا تھا وفات پا گیا اور حضرت کے مزار کے قریب دفن ہوا۔

سلطان صدرالدین کو وفات کے بعد ملک میں پھر بدنظمی پیدا ہوئی اور جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں شاہ میر صاحب سلطان شمس الدین کے نام سے تخت نشین ہوئے انھیں تین چار سال سے زیادہ حکومت نصیب نہیں ہوئی لیکن انھوں نے اسلامی حکومت کی مستحکم بنیاد رکھ دی اور کوئی ڈھائی سو سال تک ان کا خاندان اس ملک میں برسراقتدار رہا۔

اسی صدی کے اخیر میں امیر کبیر سید ہمدانی ایران سے کشمیر تشریف لائے آپ بڑے صاحب علم بزرگ گزرے ہیں اور اسلامی دنیا کی روحانی تاریخ میں آپ کا مرتبہ بہت بلند ہے آپ کی ذات میں جلالی اور جمالی شانیں دونوں موجود تھیں اور مذہب سے واقفیت اور روحانی عز و مرتبت کے علاوہ منتظمانہ قابلیت بھی آپ میں بدرجۂ اتم تھی آپ ۱۲ رجب ۷۱۴ھ (مطابق ۱۲ اکتوبر ۱۳۱۴ء) کو بمقام ہمدان پیدا ہوئے مدتوں ممالک اسلامی کی سیاحت کی۔

مشہور ہے کہ آپ نے ایک ہزار چار سو اولیاء اللہ سے ملاقات کی لیکن آپ کا اصل تعلق کبرویہ سلسلے سے تھا جو سہروردیوں کی ایک شاخ ہے ۱۳۶۹ء میں آپ ایران چھوڑ کر سات سیدوں کے ساتھ کشمیر تشریف لائے بادشاہ وقت آپ کے ساتھ بڑی عقیدت سے پیش آیا اور آپ نے اور آپ کے رفقا نے بڑی سرگرمی سے اشاعت اسلام شروع کی، کہا جاتا ہے کہ آپ کی کوششوں سے ۳۷؍ ہزار کشمیری دائرہ اسلام میں آئے آپ نے کئی ایک کتابیں لکھی ہیں مثلاً مجمع الاحادیث شرح اسمائے حسنی شرح فصوص الحکم مراۃ التائبین، ذخیرۃ الملوک آپ کی آخری تصنیف امور ملکی اور سیاسی مصلحتوں کے متعلق ہے آپ کی اور آپ کے رفقا کی کوششوں سے اسلام کشمیر میں مستحکم بنیادوں پر قائم ہو گیا آپ کی وفات ۱۳۸۴ء میں ضلع ہزارہ اور بقول بعض کافرستان کے علاقے میں ہوئی لیکن نعش مبارک ترکستان کے شہر ختلان میں لے جا کر دفن کی گئی۔

تواریخ اعظمی میں لکھا ہے کہ آپ نے تین مرتبہ ربع مسکون کی سیر کی اور اس سلسلے میں تین دفعہ کشمیر آئے آخری دفعہ وفات سے تھوڑا عرصہ پہلے ۷۷۶ھ میں تشریف لائے تھے جب آپ پہلی مرتبہ ۷۷۱ھ میں تشریف لائے تھے تو سید محمد خادری نے تاریخ لکھی ہے۔

میر سید علی شیر ہمدان     سیر اقلیم سبعہ کرد نکو

شد مشرف مقدس کشمیر اہل آن شہر راہ ہدایت جو
سالِ تاریخ مقدمۂ اورا یابی از مقدمہ شریف او

اس وقت آپ کے ساتھ سات سو سادات عظام تھے کشمیر پہنچ کر آپ نے محلّہ علاؤ الدین پورہ میں قیام کیا پانچ وقت کی نماز دریا کے کنارے جہاں اب آپ کی خانقاہ ہے ادا فرماتے اور خلقت کو ارشاد و ہدایت سے فیضیاب کرتے بادشاہ وقت سلطان قطب الدین آپ کی خدمت میں اکثر حاضر ہوتا اور آپ کا بڑا ادب کرتا اس نے ایک خلاف شرع حرکت کر رکھی تھی یعنی دو خواہران حقیقی کو اپنے نکاح میں لے آیا تھا حضرت کے ارشاد پر اس نے اپنی غلطی کا ازالہ کیا شروع شروع میں ہندوانہ لباس پہنتا تھا حضرت کے ارشاد پر اسے ترک کیا اور اسلامی ممالک کا لباس اختیار کیا مرزا حیدر نے تاریخ رشیدی میں لکھا ہے کہ حضرت نے کشمیر میں ۴۰ روز سے زیادہ قیام نہیں کیا اور تواریخ اعظمی کی نسبت یہ بیان زیادہ معتبر معلوم ہوتا ہے لیکن حضرت کے کشمیر سے چلے جانے کے بعد آپ کے اکثر رفقا یہیں رہ گئے اور آپ کی خانقاہ کشمیر میں اشاعت اسلام کا سب سے بڑا مرکز بن گئی۔

امیر کبیر سید ہمدانی کے جو خلفا کشمیر میں بس گئے اور یہیں وفات پا کر دفن ہوئے، کئی تھے۔ ان میں سے ایک میر سید حسین سمنانیؒ تھے جنھیں حضرت نے کشمیر آنے سے پہلے دریافت حالات کے لئے بھیجا تھا اور ان کی طرف سے اطلاع آنے پر خود تشریف لائے تھے ایک رفیق سفر شیخ سلیمان کشمیری تھے وہ امرائے ہنود میں سے تھے مسلمان ہو کر قرآن مجید حفظ کیا لیکن ترک مذہب کی وجہ سے ان کے عزیز و اقارب ان کے خلاف ہو گئے اور انھیں سخت پریشان کیا چنانچہ وہ برگشتہ ہو کر بمقام کولات حضرت امیر کبیرؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان کے ہمرکاب ۃ رہنے لگے جب حضرت کشمیر تشریف لائے تو وہ بھی ساتھ تھے اور چونکہ اب کشمیر میں حالات بہتر ہو گئے تھے یہیں اقامت پذیر ہو گئے ایک اور خلیفہ محمد کاظم صاحب المشہور بہ سید قاضی تھے جن کی تحویل میں حضرت امیر کبیرؒ کا کتب خانہ تھا انھوں نے علاقۂ لتاپور میں اشاعت اسلام کی اور وہاں کے باشندوں کو مسلمان کیا۔

حضرت امیرؒ کی وفات کے بعد ان کے صاحبزادے میر محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہمدانی کئی سو ہمراہیوں کے ساتھ کشمیر تشریف لائے، اور بارہ سال تک (بلکہ بقول بعض بائیس سال تک) اشاعت اسلام میں سرگرم رہے، حاکم وقت سلطان سکندر بت شکن ان کا بڑا معتقد تھا، اور وزیر شاہ سنہا بھٹ بھی جو آپ کی آمد کے بعد مسلمان ہوا اور ملک سیف الدین کے لقب سے ملقب ہوا، آپ کا بے حد پاس کرتا تھا، اس نے آپ سے اپنی بیٹی بیاہ دی، آپ بادشاہ کے ایما پر کئی کتابیں لکھیں، ایک علمِ تصوف میں

ہے، ایک رسالہ شرح منطق ایک رات میں ختم کیا، تذکرہ نگار لکھتے ہیں کہ آپ کے زمانے میں احکام شرعی کشمیر میں اس طرح نافذ ہوتے تھے کہ سماع بالمزامیر اس خطے میں بالکل نہ تھا اور نوبت بھی دروازہ شاہی کے سوا کہیں نہ بجتی تھی ۷۹۶ء میں آپ نے خطہ کشمیر کو خیرباد کہا، اور حج کے لیے روانہ ہوئے، رخصت کے وقت آپ نے بادشاہ کو اشاعت اسلام کی تاکید فرمائی، حج سے واپسی کے بعد آپ ختلان چلے گئے جہاں آپ کے والد بزرگوار کا مزار تھا، اور وہیں وفات پائی۔

سلطان سکندر بت شکن کے زمانے میں بت خانوں کے انہدام اور ہندوؤں بالخصوص برہمنوں کی ایذا دہی میں جو اہتمام ہوا، اس کا باعث اس کے وزیر سنہا بھٹ کی ذات تھی، وہ نیا نیا مسلمان ہوا تھا، اور عام نو مذہبوں کی طرح اس کے دل میں نئے مذہب کے لیے خاص جوش وخروش تھا، اس کے علاوہ چونکہ ترک مذہب کی بنا پر اسے راسخ الاعتقاد ہنود نفرت وحقارت کی نظر سے دیکھنے لگے تھے، اس کے دل میں بھی ان کے خلاف غصے اور انتقام کا جذبہ پیدا ہوا، اسے اپنے قدیم مذہب کی کئی رسمیں بھی سخت غیر منصفانہ معلوم ہوتی تھیں، بالخصوص بیواؤں کو مردہ شوہروں کے ساتھ جبراً زندہ جلا دینے کی رسم، اس نے اس مٹا دینے کا فیصلہ کیا اور ان لوگوں کو ملک بدر کر دیا جو یہ رسم نہ چھوڑ دیتے تھے۔

سلطان سکندر کی وفات کے بعد اس کا بیٹا سلطان علی شاہ تخت نشین تھا، اس کا وزیر بھی سنہا بھٹ تھا، اس لیے اس کے زمانے میں بھی یہ آئین جاری رہے، لیکن اس نے چار پانچ سال کی حکومت کے بعد تخت تاج اپنے چھوٹے بھائی شادی خان کو تفویض کیا جو بالآخر راجا جسرتھ خان گکھر کی مدد سے ۸۲۶ھ میں سلطان زین العابدین کے نام سے خود مختار بادشاہ ہوا، اس نے سلطان سکندر اور سنہا بھٹ کے سب قوانین بدل دیے، جو لوگ ملک بدر ہوئے تھے، انھیں واپس بلالیا، جزیہ ترک کر دیا، اور گاؤکشی کی بھی ممانعت کی بلکہ بیواؤں کو زندہ جلانے کی اجازت بھی از سر نو دے دی، برہمن اور دیگر ہندو جو سکندر کے عہد میں دکھاوے کے لیے مسلمان ہوئے تھے، پھر اپنے پرانے مذہب پر آ گئے، اور ان سے کسی طرح تعرض نہ کیا گیا، سلطان زین العابدین کو کشمیر کا اکابر کہتے ہیں، اور اس کے حالات سے پتا چلتا ہے کہ وہ قابلیت اور اخلاق میں اکبر سے بڑھتا ہوتھا، اس نے اکبر کی طرح ایک نیا مذہب جاری کر کے مسلمانوں کو برگشتہ نہیں کیا، اور باوجودیکہ اس نے ہندوؤں کے انتہائی رواداری اور دلجوئی کا سلوک کیا، مسلمانوں نے اس کی مخالفت نہ کی، اس کے زمانے میں علم وفن اور شعر وسخن کو بڑا فروغ ہوا، کشمیر کی مشہور تاریخ راج ترنگی تصنیف ہوئی بادشاہ تبّتی، فارسی، کشمیری، ہندی اور دوسروں

زبانوں کا ماہر تھا، اوراس نے تصنیف وتالیف کو بڑی تقویت دی، سوم نام ایک کشمیری نے جو کشمیر زبان کا شاعر اورعلوم ہندیہ میں ماہر تھا، اس کے حالات میں ایک مفصل کتاب لکھی ہے، اور بودی بھاٹ نے موسیقی کی ایک کتاب بادشاہ کے نام پر معنون کی سلطان زین العابدین باون برس تک بر سرحکومت رہا، اور بالآخر ۱۴۷۲ء میں فوت ہوا۔

سلطان زین العابدین کے عہدحکومت میں رواداری اور مذہبی آزادی کا دور دورہ تھا لیکن اشاعت اسلام کا کام اس زمانے میں بھی بند نہ ہوا، ڈاکٹر غلام محی الدین صوفی کشمیر کی تاریخ موسومہ کشمیر میں لکھتے ہیں کہ راجپوتوں کے دو بڑے قبیلے جو بارہ مولہ اور وکوہالہ کے درمیان دریائے جہلم کے کنارے پر آباد ہیں، سلطان زین العابدین کے عہد حکومت میں مسلمان ہوے۔

واقعہ یہ ہے کہ حضرت علی ہمدانی اوران کے صاحبزادے اور رفقائے کار کی سرگرمیوں نے کشمیر میں ایک روحانی ہلچل پیدا کردی تھی۔ اوراب مقامی اولیاء اور مبلغین کا ایک ایسا گردہ برسرکار آیا، جنھیں بابا مسلمان رشی (یا ریشی) کہتے تھے، یولوگ نہایت سادہ زندگیاں بسرکرتے اور ہندومسلمان دونوں انھیں نگاہِ احترام سے دیکھتے۔ ان میں سب سے زیادہ شہرت شیخ نورالدین نے پائی۔ جنھیں ہندو نندہ رشی کہتے ہیں۔ اورجن کی نسبت بابا داؤدخا کی نے لکھا:

شیخ نور الدین ریشی، پیر جمع ریشیاں زاہدے خوش بود باحق داشت بسیار اشتغال
بود با تجرید وتفرید اہل صوم دہر نیز تارک لحم وبصل، شیروعسل، بسیار سال
صاحبِ کشف وکرامت بودونطق خوب داشت ہم اویسی بود گفت ایں داؤدی صاحب مقال

شیخ نورالدین کے والد یاسمن ریشی کے ہاتھ پر مسلمان ہوئے تھے۔ وہ خود ۱۳۷۷ء میں پیدا ہوئے۔ اور سلطان زین العابدین کے عہد حکومت میں ۱۴۳۸ء میں وفات پاگئے۔ آپ کشمیر کے سب سے بڑے ولی سمجھے جاتے ہیں۔ اور جب انیسویں صدی کے آغاز میں کچھ عرصہ کے لئے کشمیر میں افغانوں کی حکومت قائم ہوئی تو کشمیر کے گورنر عطا محمد خان نے ان کی وفات کے کوئی چار سو سال بعدان کے نام کے سکے بنوائے۔

سلطان زین العابدین کی وفات کے بعد کشمیر میں بڑی کھلبلی مچی۔ ۱۴۸۷ء میں عراق سے میر نور بخش کا مرید شمس الدین کشمیر آیا۔ اوراس ملک میں نوربخشی عقائد کی اشاعت شروع کی۔ ابتداء میں خلقت نے اس پر بڑا اعتماد کیا۔ اس کے مریدوں کے لئے دیہات وقف ہوئے اور خانقاہیں رہنے کے ملیں۔ یہ لوگ میر نوربخش کو مہدی آخرالزماں سمجھتے ہیں۔ اور باقی اکثر عقیدوں میں شیعوں سے

ملتے جلتے ہیں۔تھوڑے عرصے میں چک قوم کے لوگوں نے جو بعد میں کشمیر کے حکمران ہوئے یہ مذہب اختیار کرلیا۔اور کشمیر میں اس شیعہ سنی مسئلے کا آغاز ہوا۔جس نے بعض اوقات بڑی تلخ صورت اختیار کرلی۔آخر میں اس ملک میں شیعوں کی ایک کثیر تعداد ہوگئی؛لیکن شیعوں نے فقط سنی مسلمانوں میں ہی اپنے خیالات کی تلقین نہیں کی بلکہ ہندوؤں میں بھی بڑے جوش سے اپنے عقائد پھلائے۔میر شمس الدین کی نسبت مشہور ہے کہ انھوں نے ایک ایک دن میں بیس بیس ہزار ہندوؤں کو مسلمان کیا۔ اور بہت سے ہندو وشیعہ مبلغین اور حکام کی بدولت پہلے ہی مسلمان ہوئے۔

۱۵۸۶ء تک کشمیر حکومت دہلی کے اثر سے آزاد رہا۔لیکن جب شیعہ چکون نے سنیوں پر کثرت سے مظالم شروع کئے تو بابا داؤد خاکی کی شیخ یعقوب صیرفی وغیرہ کا ایک وفد اکبر کے پاس فریاد لے کر گیا۔اور اکبر نے اسی سال یہ فتح کر کے اسے مقبوضات مغلیہ میں داخل کیا۔(۱)

(۱) مرجع سابق،ص:۳۷۴-۳۸۲۔

# مبحث ثانی: مغلیہ دور حکومت اور نظام تعلیم

## خاندان تغلق کے زمانے میں علم وادب

خاندان تغلق کا پہلا بادشاہ سلطان غیاث الدین تغلق تھا، اسے پانچ سال سے زیادہ حکومت کرنا نصیب نہ ہوا، اس کی بے وقت وفات کے بعد محمد بن تغلق جانشیں ہوا۔(١)

## عہد محمد بن تغلق

شیخ عبدالحق محدث محمد تغلق کے زمانے میں علماوفضلا کی کمی کا ذکر کرتے ہیں، لیکن پھر بھی اس زمانے کی کئی ہستیاں قابل ذکر ہیں، مثلاً ضیاء الدین برنی، ابن بطورطہ سیاح، ظہیرالدین جوفن تعمیر کا ماہر تھا، شہاب الدین ابوالعباس احمد، جوفن خطابت میں بے نظیر تھا، مشہورترین شاعراور ملک الشعرا بدر چاچ تھا، وہ چاچ یعنی تاشقند کا رہنے والا تھا، سلطان نے اس کی بڑی قدر کی اور فخر الزمان کا خطاب دیا وہ خود کہتا ہے۔

دریں در بدر چاچی راسخن شیریں علامے داں
اگر چہ خسرو عالم کندہ ''فخر الزماں'' بخش

بدر کے سارے قصائد سلطان محمد تغلق کی مدح میں ہیں، اور چونکہ ان میں بعض تاریخی واقعات کی طرف اشارہ ہے اور اس عہد میں تاریخی مواد کی کمی ہے، اس لیے مورخین ان قصائد کو تاریخ کی حیثیت سے بھی استعمال کرتے ہیں اور الیٹ نے اپنے تاریخ میں بعض کا ترجمہ کیا ہے، یہ قصائد اب بھی بعض جگہ درس میں شامل ہیں، لیکن طرز تحریر کی غرابت، معموں کی فراوانی، مشکل الفاظ اور پیچیدہ اور دقیق تشبیہوں کی وجہ سے ان سے محفوظ ہونا ہر ایک کا کام نہیں!

قصائد کے علاوہ بدر چاچ نے ایک مثنوی ''شاہ نامہ'' لکھی، بدایونی کہتا ہے ''وہمیں کہ تاریخ منظوم است غنیمت است''۔

سلطان محمد تغلق خود شاعر تھا، ذیل کے ابیات اس نے حالت نزع میں کہے۔

بسیار دریں جہاں طپیدیم　　بسیار نعیم وناز دیدیم
اسپانِ بلند برنشستیم　　ترکانِ گراں بہا خریدیم
کردیم بسے نشاط وآخر　　چوں قامتِ ماہِ نو خمیدیم

(١) مرجع سابق، ص:۴۲۳۔

سلطان محمد بن تغلق کے زمانے میں مشہور سیاح ابن بطوطہ ہندوستان آیا، بادشاہ نے اس کی بڑی قدر کی اور دہلی کا قاضی مقرر کیا، کچھ عرصہ بعد اسے بادشاہ چین کے پاس اپنا سفیر بنا کر بھیجا، جس سے ابن بطوطہ کو نہ صرف شمالی اور وسطی ہندوستان بلکہ مالا بار، مالدیو، سیلون، معبر، بنگلہ، اراکان، سماٹرا اور چین کے مشہور ساحلی مقامات دیکھنے کا موقع ملا، ان کے دلچسپ حالات اس نے اپنے سفر نامے میں لکھے ہیں، اس سفر نامے کا اردو ترجمہ خان بہادر مولوی محمد حسین نے بڑے سیر حاصل اور فاضلانہ حواشی اور تشریحات کے ساتھ شائع کیا ہے، جن سے ترجمہ کی قدر و قیمت اصل کتاب سے دو چند ہوگئی ہے۔

اس زمانے کے ایک مشہور عالم مولانا معین الدین عمرانی تھے، جنھوں نے کنز، منار، حسامی، تلخیص اور مفتاح پر حواشی لکھے، سلطان محمد بن تغلق نے انھیں شیراز اس غرض سے بھیجا کہ مواقف کے مؤلف قاضی عضد کو ہندوستان لیکر آئیں، جب شیراز کے حاکم نے یہ سنا تو وہ قاضی کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہا کہ مجھ سے میری حکومت لے لو، لیکن یہاں سے نہ جاؤں، اس پر قاضی نے ہندوستان آنے کا ارادہ ترک کر دیا، اور مولانا کو ناکام واپس آنا پڑا (اخبار الاخیار)۔(۱)

## ضیاء الدین برنی

سلطان محمد تغلق کا ایک اور ہمعصر اس زمانے کا بہترین مؤرخ ضیاء الدین برنی تھا، جس کی تاریخ فیروز شاہی اس زمانے کے حالات کا بیش قیمت خزانہ ہے، وہ برن میں جسے اب بلند شہر کہتے ہے ۶۸۴ھ کے قریب پیدا ہوا، اس کے والد اور متعلقین دربار سے وابستہ تھے، اسے بھی بڑی اچھی تعلیم دی گئی، اور ذہانت اور ذکاوت تو خداداد تھی، جب اس نے حضرت سلطان المشائخ سے بیعت کی تو ان کی کشش سے خود بھی غیاث پور میں سکونت اختیار کی جب وہ وفات پا گئے اور سلطان محمد تغلق تخت نشیں ہوا تو اپنی حاضر جوابی اور فن ندیمی کی بدولت بادشاہ کے مزاج میں اچھا دخل پالیا اور اس کی کتاب کے مطالعہ سے پتا چلتا ہے کہ بادشاہ نے کئی نازک موقعوں پر اس سے مشورہ، یا کم از کم اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

سیر الاولیا میں لکھا ہے:

> ''آپ اپنی لطافت طبع کی وجہ سے فن ندیمی میں اپنی نظر آپ ہی تھے،
> آخر کار اس فن کی بدولت سلطان محمد تغلق کے ندیم خاص مقرر ہوئے
> اور اس دنیائے غدار و مکار و بے وفا کی دولت سے کافی حصہ لیا، جب

(۱) مرجع سابق، ص: ۴۲۳-۴۲۴۔

آپ کی عمر کے ستر سال گزر گئے تو آپ نے شاہی ملازمت ترک کر کے گوشہ نشینی اختیار کی اور بے نظیر کتابوں کی تصنیف و تالیف شروع کیا''۔

جب فیروز بادشاہ ہوا تو برنی نے اپنی کتاب کا نام بادشاہ وقت کی رعایت سے تاریخ فیروز شاہی رکھا، لیکن بادشاہ کسی بناء پر اس سے ناراض ہی رہا، اور کوئی قابل ذکر خدمت اسے تفویض نہ کی، بعد میں بادشاہ نے اس کا معمولی سا وظیفہ مقرر کر دیا، لیکن وہ اس کی ضروریات کے لیے نا کافی تھا، اور اس کی وفات ۷۵۸ھ میں احتیاج کی حالت میں ہوئی، بلکہ سیر الاولیا کے مطابق '' آخری دم آپ کے پاس روپیہ پیسہ کوئی نہ تھا بلکہ آپ نے بدن کے کپڑے تک سب راہ خدا میں دے دیے تھے، چنانچہ آپ کے جنازے پر صرف ایک بوریا اور ایک چادر تھی''۔

تاریخ فیروز شاہی اصل میں طبقات ناصری کا تکملہ ہے اور اس میں سلطان غیاث الدین بلبن کی تخت نشینی جلوس (۶۶۴ھ) سے سلطان فیروز شاہ کے چھٹے سال جلوس (۷۵۸ھ) تک واقعات ہیں، برنی منہاج کی نسبت کہیں زیادہ دلچسپ واقعات کا بیان کرتا ہے، اور اس کا طرز تحریر بھی زیادہ شگفتہ ہے، اس لیے تاریخ فیروز شاہی طبقات ناصری کی نسبت زیادہ مقبول ہے۔

برنی کا فن تاریخ نگاری کے متعلق ایک خاص نقطہ نظر تھا، وہ جس قدر اہمیت بیان واقعات کو دیتا تھا، اس سے زیادہ توجہ ان واقعات سے نتائج اخذ کرنے اور ان کے ذریعہ سے احکام جہانبانی کو نمایا کرنے میں صرف کرتا۔

امور ملکی میں بھی برنی ایک خاص نظریے کا قائل تھا اور جن فرمانرواؤں (مثلاً علاء الدین خلجی) کے واقعات زندگی اس نظریے سے مطابقت نہ کرتے، ان کا صحیح اندازہ لگانا اس کے لیے مشکل ہو جاتا ہے اس کا نظریۂ تاریخ نگاری محدود اور ناصحانہ سہی، لیکن کم از کم اسے اس فن شریف کی ذمہ داریوں کا احساس تھا، اور وہ انھیں نبھانے کی پوری کوشش کرتا، اس کی کتاب میں تاریخ نگاری فقط وقائع نویسی نہیں رہی بلکہ ایک تخلیقی فن کے مرتبے کو پہنچ گئی ہے (اور وہ بھی صحت بیان کو قربان کیے بغیر) اس کے علاوہ تاریخ فیروز شاہی میں کئی غیر معمولی شخصیتوں (مثلاً بلبن، علاء الدین خلجی، محمد بن تغلق) کی جو چلتی پھرتی، زندہ جاوید تصویریں ہیں، ان کا جواب قدیم تاریخوں میں کہاں ملے گا؟(۱)

(۱) مرجع سابق، ص: ۴۲۶-۴۲۷۔

## عہد فیروزی (۱۳۵۱ء-۱۳۸۸ء)

محمد تغلق کی وفات کے بعد امرا و علماء نے غیاث الدین تغلق کے بھتیجے فیروز کو تخت دہلی کے لیے منتخب کیا، اس بادشاہ کا زمانہ ہندوستان کی تاریخ میں امن وامان اور رعیت پروری کے لیے یادگار رہے، سب سے پہلا کام جو اس نے کیا وہ ان قیدیوں کی رہائی تھی جنھیں محمد بن تغلق نے جیل خانوں میں ڈالا تھا، جن لوگوں کو محمد بن تغلق نے قتل کروادیا تھا، ان کے پسماندگان کو خون بہا دیا، اس کے علاوہ پرانے بادشاہوں نے جو دیہات، اراضی یا دوسری جائدادیں ناجائز طور پر ضبط کر کے بادشاہی مقبوضات میں داخل کر لی تھیں' ان کو واپس کیا، فیروز شاہ نے اعلان کیا کہ جو کوئی شرعی عدالت کے سامنے اپنے حقوق ثابت کر سکے گا، اسے اس کی جائیداد واپس مل جائے گی، چنانچہ بہت سے لوگوں نے اپنے حقوق ثابت کر کے جائدادیں واپس لیں۔

فیروز شاہ نے رعایا کی بہبودی کے لیے بہت محنت کی، کئی نہریں کھدوائیں، دوسو سرائیں مسافروں کی سہولت کے لیے بنوائیں، شفاخانے کھولے، جہاں ناداروں کا معالجہ مفت ہوتا تھا، سو کے قریب پل بنوائے، کئی شہر آباد کیے، جن میں جونپور، فتح آباد اور فیروز آباد مشہور ہیں، اس نے سرکاری لگان ادا کرنے میں لوگوں کو سہولتیں دیں اور اس کے زمانے میں رعیت بہت خوشحال تھی، دکن اور بنگال محمد بن تغلق کے زمانے میں خود مختار ہو گئے تھے، فیروز تغلق نے ان علاقوں کو فتح کرنے کی کوئی سرگرم کوشش نہیں کی، اور حکومت دہلی میں جو انتشار شروع ہوا تھا، اسے وہ قطعاً نہ روک سکا، لیکن جو علاقے اس کے قبضے میں تھے، وہیں رعیت کی بہبودی کا بڑا خیال رکھا، مشہور لغات قاموس کے مصنف مولانا مجدالدین فیروز آبادی اس زمانے میں ہندوستان آئے، عہد فیروز شاہی کے تین اور قابل ذکر بزرگ مولانا احمد تھانیسری قاضی شہاب الدین دولت آبادی کے استاذ مولانا خواجگی اور قاضی عبدالمقتدر دہلوی تھے، مشائخ میں سب سے زیادہ مشہور مخدوم نصیرالدین دہلیؒ تھے، سلطان محمد تغلق نے ان کی بڑی بے ادبی کی تھی، لیکن فیروز شاہ نے ان کی قدر و منزلت کی، بلکہ جب سلطان محمد بن تغلق کی وفات کے بعد فیروز تغلق عنان حکومت سنبھالنے سے گریز کرتا تھا اور حج اور زیارتوں کے لیے جانے کا خواہاں تھا تو آپ نے ہی دوسرے علماء و مشائخ کے ساتھ جا کر اسے بادشاہت پر آمادہ کیا، اور بادشاہ ہو جانے کے بعد بھی فیروز تغلق نے کئی باران سے مشورہ کیا، شیخ صدرالدین ملتانی اس دور کے دوسرے بڑے شیخ تھے، انھیں بادشاہ نے شیخ الاسلام کا خطاب دیا تھا۔

سلطان فیروز شاہ تغلق کے عہد حکومت میں علم وادب کو بڑا فروغ ہوا، افسوس ہے کہ اس کی وفات کے بعد حکومت کو زوال آ گیا، اور اس بدامنی کی وجہ سے جو حملہ تیمور کے دوران میں رونما ہوئی بہت سے اہل علم دہلی سے منتشر ہو گئے، اور اس زمانے کے علمی وادبی حالات کہیں مرتب نہ ہوئے، لیکن معاصرانہ تذکروں اور اخبار الاخیار اور بدایونی میں جو منتشر اشارات ملتے ہیں، ان سے خیال ہوتا ہے کہ علم وفضل میں یہ زمانہ عہد علائی سے کم نہ تھا۔

معلوم ہوتا ہے کہ شعر وشاعری کی طرف اہل دولت کی خاص توجہ نہ تھی، لیکن پھر بھی اس زمانے میں کئی قابل ذکر شاعر تھے، ایک مسعود بک تھے، جن کو اقارب فیروز شاہ سے بتایا جاتا ہے، اور جن کا دیوان حیدرآباد دکن میں چھپ چکا ہے، ان کا اصل نام شیر خاں تھا، مسعو بک غالباً خطاب تھا، ایک مدت تک اہل ثروت کی زندگی بسر کی، پھر درویشی کی طلب پیدا ہوئی، اور شیخ رکن الدین بن شیخ شہاب الدین کے مرید ہوئے انہوں نے اشعار کے علاوہ تصوف میں کئی کتابیں لکھیں، مثلاً تمہیدات، مراۃ العارفین، دوسرا حمید قلندر تھا جس نے حضرت چراغ دہلیؒ کے ملفوظات (خیر المجالس) مرتب کیے، تیسرا قابل ذکر شاعر ظہیر دہلوی تھا جو صاحب دیوان تھا اور جس کے بعض قصائد کا انتخاب بدایونی نے درج کتاب کیا ہے، امیر خسرو کے صاحبزادے امیر احمد بھی ایک خوش مذاق شاعر مانے جاتے تھے انہیں ایام میں ایک طبیب شہابی نے ایک مثنوی طب شہابی کے نام سے لکھی، لیکن اس زمانے کا بہترین شاعر مطہر تھا، وہ کڑہ (جوالہ آباد سے ۴۰ میل شمال مغرب کو قدیم زمانے میں صوبے کا دار الحکومت تھا) کا رہنے والا تھا اور فیروز شاہ اور اس کے امرائے عہد کا مداح تھا اس کے ممدوحوں میں ایک امیر ملک الشرق ملک عین الملک تھا، جس کی انشائیں ماہر ومشہور ہیں، مطہر خود ایک عالم تھا، اور اس کا نصاب، نصیب اخوان جو ۷۷۶ھ میں تالیف ہوا، ہندوستان میں بہت مقبول رہا ہے۔

بدایونی لکھتا ہے کہ مطہر کا دیوان پندرہ ہزار اشعار پر مشتمل تھا، لیکن یہ دیوان شیخ عبدالحق محدث کے زمانے میں ہے ''کمیاب بلکہ نایاب'' ہو گیا تھا، خوش قسمتی سے ڈاکٹر وحید مرزا کو اس کا ایک نامکمل نسخہ حاصل ہوا اور ڈاکٹر صاحب اور مولوی محمد شفیع پرنسپل اورینٹل کالج لاہور نے کالج میگزین میں بیش قیمت مضامین سے اور شاعر کو ایک نئی زندگی دے دی۔ (۱)

## فقہ کا فروغ

شعر وشاعری کے علاوہ فقہ نے اس زمانے میں بڑا فروغ پایا، علاء الدین خلجی کو مذہبی علوم سے

(۱) مرجع سابق، ص: ۴۲۹-۴۳۲۔

دلچسپی نہ تھی، اوراس کے زمانے میں اہل شرع کوکوئی قدرومنزلت حاصل نہ ہوئی، لیکن جب سلطان غیاث الدین تغلق تخت نشیں ہواتو شرع اوراہل شرع کو نیاوقار حاصل ہوا۔

اس کے بعد فقہی اور ترویج شرع پر زیادہ توجہ ہوتی گئی، اور عہد فیروزی میں کئی قابل ذکر فقہی تصانیف کے نام ملتے ہیں، ہندوستان فقہ کی قدیم کتابوں میں فقہ فیروز شاہی بہت مشہور ہے، اس کے علاوہ فیروز شاہ کے ایک امیر خان اعظم تا تارخاں نے جس کی وفات ۱۳۵۱ھ کے چندسال بعد ہوئی، علوم دینیہ میں دومبسوط کتابیں مدون کرائیں، اس میں سے ایک تفسیر ہے ''دوسری فقہ سے تعلق رکھتی ہے، اس میں فقہ کے ہزار ہا مسائل فقہا کے اختلافات اور ہر مسئلہ کی نسبت ان کے فتاوے جمع ہیں...کتب خانہ آصفیہ میں اس کا ایک نسخہ جونویں صدی کا مکتوبہ ہے، نو جلدوں میں محفوظ ہے''۔ یہ کتاب الفتاویٰ تا تارخانیہ کے نام سے مشہور ہے، اوراس کے مدون کا نام مولانا عالم بن علاء الدین حنفی تھا، اس زمانے میں لوگ فقہ سے اس قدر مانوس ہو گئے کہ حضرت چراغ دہلیؒ کے ایک مرید مولانا رکن الدین سے فقہی مضامین کے متعلق ایک طویل مثنوی طرفۃ الفقہا کے نام سے لکھی، اس میں تیس ہزار سے زیادہ اشعار ہیں۔(۱)

## دوسری علمی سرگرمیاں

فیروز شاہ کے زمانے کا ایک اور قابل ذکر واقعہ سنسکرت کی کئی کتابوں کا فارسی ترجمہ ہے۔

بدایونی کا ہندو مذہب اور ہندوعلوم کی نسبت جونقطہ نظر تھا، اس کے ہوتے ہوئے اسے ہندوعلوم کی کوئی کتاب کیسے پسند آسکتی تھی لیکن دلائل فیروزی کی نسبت فرشتہ لکھتا ہے ''والحق آں کتاب کیسے پسند آسکتی تھی، لیکن دلائل فیروزی کی ن سبت فرشتہ لکھتا ہے ''والحق آں کتاب است متضمن اقسام علمی وعملی''، بدایونی نے فن موسیقی کی جس کتاب کا ذکر کیا ہے، وہ غالباً بارہ سنگتا ہے، جو فیروز شاہ کے حکم سے عبدالعزیز شمس تھانیسری مؤلف تاریخ فیروز شاہی نے سنسکرت سے فارسی میں ترجمہ کی۔

ان کے علاوہ علامہ شیرانی لکھتے ہیں:

> ''فیروز شاہ کے دور میں یہ امر آب زر سے لکھنے کے لائق ہے کہ ہندوی زبان میں مثنوی بھی لکھی گئی ہے، مولانا داؤد نے کتاب چند ابن جولورک اور چندا کا عشقیہ افسانہ ہے، جو ناشہ خان جہاں خلف وزیر خان جہاں کے نام پر لکھی ہے''۔

(۱) مرجع سابق، ص:۴۳۲-۴۳۳۔

اس مثنوی کو بدایونی کے زمانے تک بڑی مقبولیت حاصل تھی، وہ منتخب التواریخ میں لکھتا ہے:

''واز نہایت شہرت دریں دیار احتیاج بہ تصرف ندارد، ومخدوم تقی الدین واعظ ربانی در دہلی بعضے ابیات تقریبی اورا بر سر منبر میخواند، ومر دم راازاستماع آں حالات غریبیہ روے می داد''۔

اس زمانے کی ایک اور دلچسپ کتاب فتوحات فیروز شاہی ہے، جس میں خود بادشاہ نے اپنے کارنامے گنائے ہیں، یہ کتاب تاریخی نقطۂ نظر سے بہت اہم ہے اور اس سے نہ صرف ان کوششوں کا پتہ چلتا ہے، جو بادشاہ نے پاک وہند میں اسلام اور اسلامی علوم بالخصوصی فقہ کی تنظیم وترتیج کے لیے کیں، بلکہ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ بعض مذہبی ومعاشرتی مسائل کا آغاز جن کا حل آج مسلمان تلاش کر رہے ہیں، فیروز شاہ کے زمانے میں ہو چکا تھا، مثلاً جہاں تک مذہبی فرقوں کا تعلق ہے اسمعیلی شیعہ تو اس سرزمین میں بہت پرانے ہیں، اسی طرح ایک شخص رکن الدین نے سید محمد جونپوری یا مرزا غلام احمد قادیانی کی طرح مہدی ہونے کا دعوی کیا تھا، ایک صاحب احمد بہاری خدائی کے دعوی دار تھے، اور ایک صوفی نے ''انا الحق'' بھی کہنا شروع کیا، ان کے علاوہ مقابر اور مزارات پر مستورات کے جمع ہونے کی مضر اور خلاف شرع رسم اس زمانے میں شروع ہوگئی تھی، چنانچہ فیروز شاہ لکھتا ہے کہ مجھے یہ رسم جبراً بند کرنی پڑی۔(۱)

(۱) مرجع سابق، ص:۴۳۳-۴۳۵۔

# فصل ثانی

# مسلمانان ہند کی تعلیمی پسماندگی-اسباب اور حل

## یہ فصل پانچ مباحث پر مشتمل ہے

مبحث اول: ـــ بیسویں صدی عیسوی میں نصاب تعلیم قوم کی فکری ارتقاء اور ذہنی صلاحیت کا آئینہ دار

مبحث ثانی: ـــــــــــــــــــ مدارس اسلامیہ کا نصاب تعلیم اور عصر حاضر کے تقاضے

مبحث ثالث: ـــــــــــــــــــ ہندوستان میں مسلم بچوں کا تعلیمی مسئلہ

مبحث رابع: ـــــــــــــــــــ نظام تعلیم میں نظر ثانی کی ضرورت

مبحث خامس: ـــــــــــــــــــ تعلیمی پسماندگی کے وجوہات اور حل

# مبحث اول: بیسویں صدی عیسوی میں نصاب تعلیم قوم کی فکری ارتقاء اور ذہنی صلاحیت کا آئینہ دار

## نصاب تعلیم کا مسئلہ

نصاب تعلیم کوئی ایسا مسئلہ نہیں ہے جس پر رواداری کے ساتھ کوئی رائے قائم کر لی جائے، یا کسی عجلت یا جزباتیت کے ساتھ فیصلہ صادر کر دیا جائے، یہ بڑی ذمہ داری کا کام ہے، نہ اس کو معصوم قرار دینا صحیح ہے، نہ اس کو کاملا ناقص اور قابل ترک ثابت کرنا آسان ہے، حقیقت میں نصاب تعلیم کسی قوم کی فکری ارتقاء اس کے علمی تجربوں، اس کے طریق فکر اور اس کی ذہنی صلاحیت کی ہانڈی کا سر جوش ہوا کرتا ہے، نصاب تعلیم کسی قوم کے مطالعہ، اس کی فکری سطح اور اس کی ذہنی صلاحیت کا نقطہ عروج (Climax) ہوتا ہے، اس لئے کسی نصاب تعلیم پر اس قوم کے علمی تجربوں، اس ملت کی عملی نمائندگی کرنے والے گروہ کی نفسیات اور اس ملک کے ماحول سے الگ کر کے غور نہیں کیا جا سکتا، نصاب تعلیم اس ماحول کا ایک علمی اظہار ہوتا ہے، نصاب تعلیم کا بھی ایک ضمیر ہوتا ہے، اور اس کی ایک روح ہوتی ہے، جو اس کے پورے جسم میں سرایت کئے ہوئے ہوتی ہے، نصاب تعلیم کچھ بے جوڑ چیزوں کے جمع کر دینے اور پڑھائی جانے والے چند کتابوں کے بے جان مجموعہ کا نام نہیں، نصاب تعلیم کسی ملت یا کسی علمی گروہ کی اپنی ضروریات کے احساس، اپنے زمانے کے تقاضوں کے سمجھنے اور پچھلے تجربوں سے فائدہ اٹھانے کا ماحصل ہوتا ہے، اس لئے بڑی زیادتی ہوگی کہ کتابوں کی فہرست سامنے رکھ کر ہم رائے قائم کرتے چلے جائیں کہ یہ کتاب اچھی ہے، یہ کتاب اچھی نہیں، یہ کتاب کامیاب، یہ کتاب ناکام، اس فن کا یہ حصہ زیادہ ہے اور اس فن کا یہ حصہ کم، یہ نصاب تعلیم کے ساتھ ہی نہیں، علمی حقائق کے ساتھ بھی ناانصافی ہوگی۔ (۱)

## قدیم نظام تعلیم پر ایرانی اثرات

یہ نصاب تعلیم جو ہندوستان میں صدیوں سے رائج تھا، اور جس ایک ترمیم شدہ اور ترقی یافتہ شکل

(۱) نظام تعلیم مغربی رجحانات اور اس میں تبدیلی کی ضرورت، ص:۸۱-۸۲، مصنف: مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، مطبوعہ: سید احمد شہید اکیڈمی دار عرفات، تکیہ کلاں، رائے بریلی۔

درس نظامی کی شکل میں ہے جو استاذ العلماء ملا نظام الدین کا مرتب کیا ہوا ہے، یہ نصاب درحقیقت ایران کا ساختہ پرداختہ ہے، یہ ایران کے ذہن کا انعکاس ہے، یہ نصاب ایران کا عطیہ ہے جو ہندوستان کو ملا، اس لئے کہ جس عہد میں یہ نصاب متعارف ہوا، وہ عہد حکمرانی اور سیاسی طاقت کے لحاظ سے تو ترکی النسل لوگوں کا عہد ہے لیکن تہذیبی اور فکری اعتبار سے وہ ایرانیوں کا عہد ہے، ہندوستان کی تاریخ کی یہ تقسیم ہے کہ اس کی سیاسی تاریخ ترکوں اور مغلوں کے زیرسایہ پروان چڑھی اور علمی وفکری تاریخ ایرانیوں کے زیرسایہ پروان چھڑی، اور اس پر حقیقت میں ایرانیوں کا اقتدار قائم رہا ہے، اس ملک میں سیاسی حیثیت سے مغل یا افغانی النسل خاندان حکمرانی کرتے تھے، ان سے پہلے ترک حکمرانی کرتے تھے، لیکن فکری اور ذہنی حیثیت سے یہاں ایران حکمرانی کرتے تھے اور ایران حقیقت میں مشرق کا یونان ہے، ایران ویونان میں مماثلت کی اتنی باتیں ہیں کہ اگر فلسفۂ تاریخ کا کوئی طالبہ علم یہ ثابت کرنا چاہے کہ یونان کا مشرق میں بُروز ایران کی شکل میں ہوا، یا ایران کا مغرب میں بُروز یونان کی شکل میں ہوا، تو شاید غلطی نہیں ہوگی۔

ہمارے اس قدیم نصاب کا قوام (اور قوام اصل چیز ہوتی ہے) ایران میں تیار ہوا ہے اور ایران کی کچھ خصوصیات ہے جس میں ذہانت، لطافت ذوق، ادبی حاسہ، اور شاعری کا فطری ملکہ اس کی قومی ونسلی خصوصیت ہے ان سب کے ساتھ ایک چیز اور ہے وہ ہے جس کو ہمارے یہاں اردو میں ''رائی کا پربت بنانا'' کہتے ہیں، اور مولانا سید مناظر احسن گیلانی نے ''الفرقان'' کے ''شاہ ولی اللہ نمبر'' میں اس کو ''بات کا بتنگڑ بنانے'' کے بلیغ لفظوں میں ادا کیا ہے، یہ ایران کی صدیوں کی نسلی خصوصیت ووراثت ہے، کہ وہ ''رائی کا پربت'' اور ''بات کا بتنگڑ'' بنا دیتا ہے یہاں پر عرب کی فطرت اور عجم کی فطرت (اور آپ کو یہ معلوم ہے کہ عجم کا لفظ ہمارے قدیم لٹریچر میں جب بولا جاتا ہے تو اس مراد ایران ہی ہوا کرتا ہے) ایک دوسرے سے جدا ہو جاتی ہے عرب کی فطرت میں سادگی ایجاز، واقعیت پسندی اور علمیت ہے، اس بنا پر یہ کہنا صحیح ہوگا کہ اسلام کے لیے عرب کی سرزمین اور عرب قوم کے انتخاب کرنے میں یہ حکمت بھی تھی۔

ایجاز لفظی ہی نہیں ہوتا، ایجاز لسان ہی نہیں ہوتا، ذہنی ایجاز بھی ہوتا ہے، اور ذہنی ایجاز کو لسانی ایجاز پر ترجیح وفوقیت حاصل ہے، بعض قوموں اور افراد کا ذہن ایجاز پسند ہوتا ہے اور بعض کا طوالت پسند ہوتا ہے ذرا سی چیز کو جب تک پھیلا کر ان کے سامنے نہ لایا جائے ان کا ذہن اس کا ادراک کرنے سے قاصر ہوتا ہے، اس دین کو چونکہ قیامت تک رکھنا اور مختلف ادوار کے لیے اس کو آخری پیغام بننا تھا، اللہ تعالیٰ نے عربوں کا انتخاب کیا کہ جو بات کے (اس کے حدود اور دائرے میں رہتے

ہوئے اوراس کی درجۂ حرارت وبرودت کے مطابق) سمجھنے کے عادی تھے، ذہن اس کواخذ کرنے کی صلاحیت رکھتا تھا پھراس کو بے کم وکاست پہنچانے کی بھی صلاحیت رکھتا تھا، اس لئے آپ دیکھتے ہیں کہ قرآن مجید کی حفاظت کے لیے بھی اور حدیث کی اشاعت کے لیے بھی اللہ تعالیٰ نے عربوں ہی کا انتخاب کیا، اور میرا مطالعہ یہ بتاتا ہے کہ جہاں جہاں اسلام عربوں کے ذریعہ سے گیا ہے وہاں اپنی حقیق شکل میں گیا ہے، بلاتحریف، بلاغلوومبالغہ کے گیا ہے۔(۱)

## حدیث کے ساتھ بے اعتنائی کے اسباب

اس کے ساتھ ایک خاص بات یہ ہے کہ ان ملکوں میں جہاں عرب اسلام کو لے کر گئے ہیں وہاں حدیث کی اشاعت ہوئی ہے اور جہاں غیر عرب عناصر کے ذریعہ سے اسلام گیا ہے وہاں حدیث بہت بعد میں آئی ہے اور آپ سراغ لگائیں گے تو کسی عرب ملک سے اس کا ربط ملے گا عرب فطری طور پر غلوو مبالغہ سے مناسبت نہیں رکھتے تھے، ابن رشیق کی روانی کی کتاب ''العمدۃ'' میں آتا ہے کہ کسی نے حضرت سعید بن المسیبؒ سے کہا کہ "إن أناسا يكرهون إنشاد الشعر في المسجد" انہوں نے کہا کہ "لقد نسكوا نسكا عجميا"، بعض لوگ مسجد میں شعر پڑھنے کو مکروہ سمجھتے ہیں تو انہوں نے کہا کہ یہ عجمی زہد ہے، عربی زہد نہیں ہے۔

اس نسک عجمی کا تعلق عبادات ہی سے نہیں نسک عجمی کا تعلق علوم سے بھی ہے، حقائق سے بھی، ان کی ترجمانی سے بھی، ان کے مقدار کے تعین سے بھی ہے، کتنی چیز ہو اور کس مقدار میں اس چیز کو لینا چاہئے اور اشیاء کا کیا تناسب ہو؟ اس میں عربی دماغ صحیح تناسب کی طرف چلتا ہے، عجمی دماغ عدم تناسب کے طرف چلتا ہے۔(۲)

## نصاب تعلیم میں تبدیلی علمی نقطۂ نظر اور معروضی طریقہ پر ہو

نصاب تعلیم میں سنجیدگی کے ساتھ، حقیقت پسندی کے ساتھ، اور پورے انصاف وتوازن کے ساتھ غور کریں کہ جو چیز نصاب تعلیم میں اب قابل تبدیل ہوگئی ہیں، ان کو تبدیل کریں لیکن وہ تبدیلی جو ہو، وہ بے سوچے سمجھے نہ ہو، وہ کسی جذبے کے تحت یا کسی ردعمل کے نتیجہ میں نہ ہو، بالکل علمی نقطۂ نظر سے اور معروضی طریقہ پر ہو۔(۳)

(۱) مرجع سابق،ص:۸۲-۸۴۔
(۲) مرجع سابق،ص:۸۴۔
(۳) مرجع سابق،ص:۸۹-۹۰۔

# مبحث ثانی

## مدارس اسلامیہ کا نصاب تعلیم اور عصر حاضر کے تقاضے

ہندو پاک اور بنگلا دیش کے اکثر مدارس میں مروج نصاب تعلیم ''درس نظامی'' کے نام سے معروف ومشہور ہے۔ اس کو بارہویں صدی کے مشہور عالم اور مقدس بزرگ مولانا نظام الدین سہالویؒ نے اپنی فکر اور دوراندیشی سے مرتب کیا تھا۔ مولانا کا مرتب کردہ نصاب اتنا کامل اور مکمل تھا کہ اس کی تکمیل کرنے والے فضلاء جس طرح علوم دینیہ کے ماہر ہوتے تھے اسی طرح دفتری ضروریات اور ملک کی خدمات کے انجام دینے میں بھی ماہر سمجھے جاتے تھے۔ اس لئے علوم دینیہ اور علوم عصریہ کی کوئی تفریق نہ اس ملک میں تھی اور نہ دوسرے ممالک میں۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ نصاب دینی تقاضوں کے ساتھ ساتھ دنیوی تقاضوں کی تکمیل کے لئے بھی کافی تھا۔ اس لئے کہ اس کی ترتیب نے مولانا نظام الدینؒ دینی واقفیت بخشنے والی کتابوں کی شمولیت کے ساتھ ساتھ وقت اور حالات پر بھی نظر رکھ کر حالات وزمانہ کے تقاضے کے مطابق مروج فنون وزبان کی کتابوں کو بھی اس میں شامل کیا تھا۔ مولانا نظام الدینؒ بارہویں صدی یعنی سلطان اورنگ زیب عالم گیر کے زمانے کے ہیں اس زمانے میں فارسی ملکی اور سرکاری زبان تھی، اور منطق و فلسفہ کو یہ اہمیت حاصل تھی کہ یہ فنون معیار فضیلت تھے، اسی طرح علم ریاضی (Mathematic) کی بھی بڑی اہمیت تھی چنانچہ مولانا اپنی ترتیب میں حالات کے تقاضے کے مطابق قرآن، حدیث، فقہ اور ان کے متعلقات کے ساتھ ساتھ اس زمانے کے عصری علوم کو اور حالات سے ہم آہنگ نصاب مرتب کیا یہی وجہ تھی کہ یہ نصاب اس وقت بہت ہی مقبول ہوا اور اس وقت کے تقریبا تمام مدارس میں رائج ہو گیا۔ فارسی اور منطق وفلسفہ کی شمولیت اس وجہ سے قطعا نہیں تھی کہ یہ دینی علوم تھے یا یہ کہ دینی علوم کا ایسا ذخیرہ ان میں موجود تھا کہ ان کے بغیر تعلیم شریعت نامکمل رہتی، بلکہ ان کی شمولیت کا محرک صرف اور صرف ملک کے وقتی حالات تھے، جیسا کہ اس کی تائید مفتی محمد شفیع صاحبؒ کی تحریر سے ہوتی ہے:

> ''درس نظامی کے ابتدائی زمانے میں جو فارسی زبان اور دیگر علوم جیسے منطق، فلسفہ، ریاضی وغیرہ کو اعلیٰ پیمانے پر رکھا گیا تھا، یہ تو ظاہر ہے کہ یہ فنون ہمارے دینی علوم نہ تھے، یہ قرآن وسنت اور علوم دینیہ کا سمجھنا فی

نفسہ ان پر موقوف تھا، سکندر لودھی کے زمانے سے پہلے ان میں سے بعض چیزوں کا رواج ہی نہ تھا اور ریاضی وغیرہ جو رائج تھے وہ بھی اس لئے نہیں کہ قرآن وسنت یا دین کا سمجھنا ان پر موقوف تھا بلکہ صرف اس لئے کہ ایک عالم دین، ملکی، سیاسی اور دفتری معلومات میں بھی قابل و ماہر تعلیم یافتہ انسان سمجھا جائے۔ فارسی زبان ظاہر ہے کہ قرآن وسنت کی زبان نہ تھی مگر سلطنت کی دفتری زبان بن گئی تھی اس لئے تمام علمائے عصر اس میں بھی وہ مہارت پیدا کرتے تھے کہ اس میدان میں بھی وہ کسی سے پیچھے نظر نہ آئیں اور اسی وجہ اس درس کا فاضل حکومت میں بھی ہر عہدہ ومنصب کے قابل سمجھا جاتا تھا''۔

اسی طرح رئیس القلم مولانا مناظر احسن گیلانی ''درس نظامیہ'' کے بارے میں لکھتے ہیں:

''عام طور پر درس نظامیہ کے نام سے جسے شہرت حاصل ہوگئی ہے اس کے متعلق لوگوں کا یہ خیال صحیح نہیں ہے کہ وہ مسلمانوں کے صرف دینی کا نظام تھا در حقیقت اس نصاب میں اس زمانے کی دفتری زبان فارسی کی نظم ونثر و انشاء وغیرہ کی بیسیوں کتابوں کے ساتھ ساتھ حساب، خطاطی وغیرہ کی مشق کرانے کے بعد اعلیٰ تعلیم عربی زبان کی کتابوں کے ذریعہ دی جاتی تھی۔ گویا درس نظامی درحقیقت علوم دینیہ اور علوم عصریہ کا ایک حسین چشمہ تھا جس سے دین علوم کی نہریں اور عصری علوم کی نہریں دونوں بہتی تھیں اس دینی ضرورتوں کی بھی تکمیل ہوتی تھی اور دنیاوی زندگی میں بھی راہ چلنے کی روشنی اس سے ملتی تھی اس کی تکمیل کرنے والے دین کے ماہر ہونے کے ساتھ ساتھ دنیاوی علوم میں بھی ''ید طولیٰ'' رکھتے تھے، اور اگر سنجیدگی اور ہر قسم کی تنگ نظری سے الگ ہوکر غور کیا جائے تو مولانا مرحوم کا یہ نظریہ اور نصاب کی ترتیب میں ان کا مقرر کردہ اصول (جس کی روشنی میں انہوں نے اپنا نصاب مرتب کیا) بالکل صحیح اور لائق تحسین تھا۔ اس لئے کہ انسان سے ایک طرف شریعت کے مطالبات اگر وابستہ ہیں تو

دوسری جانب اس دنیا میں اس کی زندگی کی وجہ اس کے ساتھ دنیاوی معاملات اور دیناوی ضرورتیں بھی وابستہ ہیں اور شریعت اسلامیہ کا تقاضہ صرف یہ نہیں ہے کہ انسان دنیا سے مکمل منہ موڑ کر صرف اپنی زندگی کو عبادت خانوں کے اندر محصور کر لے اور اس کے دائرے میں ہی رہتے ہوئے اپنی زندگی کے لمحات گزارے، ہاں! یہ ایک حقیقت ہے کہ دین کو ترجیح اور درجہ اول دیتے ہوئے اپنی دنیا کو بھی پابند دین بنانے کا اسے ضرور پابند بنا گیا ہے اور یہ جب ہی ہوسکتا ہے جب کہ دین سے واقفیت ہو، اس لئے دین کی تعلیم اولین فریضہ ہے، اور اس کے بغیر انسانی زندگی کا مرضئ رب العالمین کے مطابق ہونا ناممکن ہے۔ اور یہی مطلب ہے ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس مبارک ارشاد کا ''**طلب العلم فريضة على كل مسلم**'' لیکن ثانوی درجہ میں دنیا کے علوم کے حصول کی ضرورت بھی مسلم ہے اسی لئے شریعت نے اس سے کسی بھی نص شرعی میں منع نہیں کیا ہے، بلکہ تاریخ اور صحابہ کے حالات وواقعات سے تو علوم دنیویہ کے حصول کی تائید ہی ہوتی ہے''۔

صحابہ کرام جو کہ خدا کی مرضی کے خلاف ایک لمحہ گزارنا پسند نہیں کرتے تھے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاک ارشادات کے ایسے دیوانے تھے کہ ایک ایک لفظ کو اپنے حافظہ میں جمع کرتے تھے اور دین کی جانکاری کے لئے ہمہ تن کوشاں رہتے تھے، انہوں نے بھی دنیاوی معاملات کو حل کرنے کے لئے دنیاوی علوم حاصل کیا اور بعض صحابہ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی تعلیم بھی دی ہے چنانچہ دفاعی قوت کے استحکام کے پیش نظر بعض صحابہ کرام آلات حرب کی کاریگری سیکھنے میں مشغول ہونے کی وجہ جہاد میں شرکت نہ کرسکے۔

حافظ ابن کثیر دمشقیؒ (م:۷۷۴) نے ''البدایہ والنہایہ'' میں دوصحابی: عروہ ابن مسعود اور غیلان ابن سلمہ کے بارے میں لکھا ہے کہ یہ دونوں حضرات آلات جنگ کی صنعت سیکھ رہے تھے اس لئے غزوۂ حنین اور محاصرۂ طائف میں شریک نہ ہوسکے، ''**ولم يشهد حنينا ولا حصار الطائف عروة بن مسعود ولاغيلان بن سلمة كان بجرش يتعلمان صنعة الدبابات والمجانيق والضبور**''۔

غزوۂ حنین اور محاصرہ طائف میں عروہ ابن مسعود اور غیلان بن سلمہ شریک نہیں ہوئے اس لئے کہ وہ دونوں مقام ''جرش'' میں دبابوں، مجانیق، قلعہ شکن توپ اور ضبور (جو ٹینک کی جگہ استعمال ہوتے تھے) کی صنعت سیکھ رہے تھے اسی طرح نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے عربی سے ناواقف لوگوں سے ''مراسلاتی تعلق قائم کرنے اور ان کو دین کی دعوت دینے کے لئے حضرت زید بن ثابتؓ کو ''زبان یہود'' سیکھنے کا حکم دیا، چنانچہ انہوں نے آپ کے حکم کی تکمیل کرتے ہوئے اس کو سیکھنا شروع کیا اور صرف پندرہ دن میں اس زبان سے مکمل واقف ہو گئے۔

حضور اکرم کا حضرت زید بن ثابتؓ کو ''زبان یہود'' کے سیکھنے کا حکم دینا، مفادات اسلامی کی خاطر دوسری زبانوں کو سیکھنے یا دوسروں کے فنون سے واقفیت حاصل کرنے کے بارے میں شرعی فیصلہ کے لئے ایک بہترین دستاویز ہے اور اس پر غور کر کے قانون اسلام میں اس کی حیثیت و اہمیت معلوم کی جا سکتی ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ صحابہ کرام نے علم و تعلیم کا اصل محور تو کتاب وسنت کو ہی قرار دیا البتہ سیاسی، سماجی اور معاشرتی ضرورتوں کی تکمیل کے لئے عام دنیا کے لوگوں کی طرح وہ بھی دنیوی علوم کو سیکھتے رہے تاکہ اس کے ذریعہ مفاد اسلامی کا حصول بھی اور اپنی زندگی کی ضرورتوں کی تکمیل میں دوسروں کی محتاجگی کی پریشانی وذلت درپیش نہ ہو تعلیم و تعلم کے سلسلہ میں صحابہ کرام اسی طریقے کو اسوہ بناتے ہوئے مولانا نظام الدین صاحبؒ ''درس نظامیہ'' کو مرتب کیا کے دین اور دنیا دونوں کی تعلیم اور دونوں سے واقفیت بخشنے والی کتابوں کو اس میں شامل کیا اور اس زمانے میں جن علوم وفنون کی زیادہ اہمیت تھی اور جن کا سکہ رائج تھا ان کتابوں کو اس نصاب میں اہمیت دیتے ہوئے کثیر تعداد میں شریک کیا چنانچہ منطق وفلسفہ اور فارسی کی کتابوں کی اس نصاب میں کثرت اسی بنیاد پر تھی، اب حالات ماضی سے بالکل بدل چکے ہیں منطق وفلسفہ کے اکثر نظریات کی دنیا میں مانگ باقی نہیں رہی ہے اور جدید سائنس نے ان کی جگہ لے لی ہے، اور ہیولیٰ، صورت جسمیہ کی تحقیق وتفتیش کے بجائے خلاؤں میں پرواز کرنے اور دنیا سے ہٹ کر ایک دنیا بسانے کی تحقیق وجستجو جاری ہے، فارسی زبان کی وسعت اتنی محدود ہو گئی ہے کہ وہ صرف ایک مخصوص علاقہ کی زبان کی حیثیت سے متعارف ہے اور اس کی جگہ عربی اور انگلش نے لے لی ہے، ہر طرف انگلش اور اس کی اصطلاحات کی گرم بازاری ہے پوری دنیا کو اس نے اپنے دامن میں جمع کر لیا ہے اور اپنی اہمیت کا لوہا ایسا منوایا ہے کی پوری دنیا میں عملی طور پر اسے اول درجہ کی زبان کی حیثیت حاصل ہے، لیکن ان حالات میں مدارس اسلامیہ کا نصاب عصر

حاضر کی دنیوی ضرورتوں کی تکمیل کے اسباب سے بالکل خالی ہے دینی ضرورتوں تو اس سے بلاشبہ مکمل ہورہی ہیں اور دینی اعتبار ان کا نصاب بہت ہی مفید ہے لیکن دنیوی ضرورتوں کی تکمیل کے لئے ان کے پاس منسوخ شدہ سکوں کے علاوہ کچھ اور نہیں۔

حالات اور طلبہ کی ذہنی حیثیت کو پیش نظر رکھتے ہوئے اس نصاب میں جزئی تبدیلی تو ہوئی لیکن صحیح بات یہ ہے کہ اس تبدیلی میں مولانا نظام الدینؒ کے اصول کو بالکل ہی سامنے نہیں رکھا گیا چنانچہ جزئی تبدیلی میں پہلے سے زیر درس بعض کتابوں کی تخفیف تو کی گئی لیکن عصر حاضر کے تقاضے کے مطابق کسی نئی کتاب یا کسی نئے فن کا اضافہ نہیں کیا گیا اور آج تک منطق وفلسفہ کی علمی موشگافیاں اور قیل وقال جاری ہیں جس کا فائدہ کچھ نظر نہیں آتا، نتیجتاً مدارس کے فضلاء کے پاس دینی ذخیرہ تو بہت کچھ ہوتا لیکن دنیاوی ضرورتوں اور تقاضوں کا ان کے پاس کوئی حل نہیں ہوتا۔

یہ ایک بڑا المیہ ہے کہ انگیریزی زبان سے واقفیت تو دور کی بات ہے کہ وہ داخلی نصاب ہی نہیں، عربی زبان جو کہ ذریعہ تعلیم ہے اور ساری کتابیں اسی زبان میں پڑھائی جاتی ہیں، نحو وصرف اور ادب کی معتدد کتابوں کی تکمیل کی جاتی ہے لیکن مدارس کے فضلاء میں ۷۵/ فیصد طلباء کی عربی زبان سے واقفیت کا یہ حال ہوتا ہے کہ نہ تو وہ کسی عربی سے گفت وشنید کرسکتے اور نہ اپنا مافی ضمیر عربی میں ادا کرسکتے اور نہ ہی اس مبارک زبان میں شائع ہونے والے اخبارات ومجلّات کو پڑھ سکتے ہیں یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس کا انکار نہیں کیا جاسکتا، آخر کیا وجہ ہے کہ انگریزی کے طلبہ تو بخوبی انگریزی سے واقفیت حاصل کرلیتے ہیں اور مادری زبان کی طرح اس پر قابل ہوجاتے ہیں لیکن عربی بولنے والے طلبہ عربی زبان سے واقف نہیں ہوتے؟

اس انحطاط کی وجہ صرف یہ کہ عربی ادب کی کتابوں کو اس انداز سے نہیں پڑھا اور پڑھایا جاتا کے اس سے زبان پر قدرت حاصل ہو بلکہ چندابواب کی تکمیل کرنے کو ضروری خیال کرتے ہوئے ترجمہ اور مطلب کے سہارے کتابوں کو مکمل کرلیا جاتا ہے مثال کے طور پر ہمارے مدارس میں داخل درس کتاب ''مقامات حریری'' کا حال یہ ہے کہ سال بھر میں اس کے پندرہ یا بیس مقامات مکمل کئے جاتے ہیں طلبہ اور اساتذہ دونوں کی توجہ صرف اس کتاب کے نادر الفاظ کو یاد کرلینے اور اس کے ترجمہ کو رٹ لینے پر مرکوز ہوتی ہے، اس جیسے جملوں کی مشق وغیرہ کا خیال کبھی دل میں گزرتا ہی نہیں ہے یہی وجہ ہے کہ امتحان کے موقع پر طلبہ اس کے ترجمہ کو زبانی یاد کرکے امتحان دیدلیتے ہیں اور امتحان کو ختم ہوتے ہی وہ یاد کردہ ترجمہ اور الفاظ بھی ذہن سے غائب ہوجاتے ہیں اور طلبہ کی صلاحیت میں کوئی

فرق نہیں آتا ہے، حالانکہ یہ کتاب مقصود بالذات نہیں ہے مقصود بالذات تو عربی زبان سے واقفیت ہے تاکہ قرآن وحدیث کی فہم میں کوئی دشواری نہ رہے اور یہ ایک حقیقت ہے کہ عربی زبان تحریری و تقریری مشق وتمرین کے ذریعہ ہی حاصل ہوسکتی ہے ہاں عربی ادب کی اعلیٰ کتابوں کے ذریعہ حاصل شدہ عربی زبان کومزید باادب اور عمدہ بنایا جاسکتا ہے۔

آج مدارس اسلامیہ کے فضلاء اوراس میں زیر تعلیم طلبہ کی حالت وصلاحیت ارباب حل وعقد کو یہ آواز دے رہی ہے کہ مدارس اسلامیہ کے نصاب پر مولانا نظام الدین کے اصول کی روشنی میں غور کیا جائے اور منطق وفلسفہ کے ''سکہ غیر رائج الوقت'' کے بجائے عصری تقاضوں کے مطابق کتابوں کو داخل کیا جائے اوراس میں پیدا کیا جائے تعطل وجمود کوختم کرکے ماضی کی طرح آج کے فضلاء کو ہر میدان کا شہسوار بنے کا موقع دیا جائے، اگر ہمارے اسلاف اپنے زمانہ کی ضروریات کے پیش نظر فارسی زبان کواپنا سکتے ہیں اور یونانی منطق وفلسفہ کو داخل نصاب کرسکتے ہیں جوکہ ہمارے دینی علوم نہیں ہیں، تو کیا وجہ ہے کہ یونانی منطق وفلسفہ کی سرد بازاری اور جدید سائنس اور انگریزی زبان کی گرم بازاری کے باوجود ہم جدید علوم کو نصاب کا جز نہ بنائیں حالانکہ آج انگریزی اور جدید علوم کے ذریعہ اسلام کی اشاعت اتنی ہوسکتی ہے جتنی ماضی میں ممکن نہ تھی یہ ایک ایسی ضرورت ہے جس کے احساس نے ہمارے اسلاف کو بھی تڑپایا ہے اوران کے دل سے بھی آواز نکلی ہے۔

چنانچہ حضرت مولانا مفتی شفیع صاحبؒ لکھتے ہیں:

> ''درس نظامی جو اب تک ہمارے مدارس میں رائج ہیں علوم دینیہ کی حفاظت و اشاعت کے لئے تو بلاشبہ کافی ہے مگر ملکی، دفتری ضروریات آج بالکل بدلی ہوئی ہیں ان میں ہمارے قدیم منطق و فلسفہ اور قدیم ریاضی اور فارسی زبان کام نہیں دیتی، آج فارسی زبان کہ جگہ انگریزی نے لے لی ہے اور قدیم معقولات کی جگہ جدید سائنس اور فلسفہ نے نیز دوسرے علوم جدید نے لے لی ہے جب ہمارے متقدمین اپنے زمانے کی ضروریات کے پیش نظر فارسی زبان کو اپنا سکتے ہیں یونانی منطق وفلسفہ اور ریاضی کی تعلیم کو نصاب کا ایک بڑا جز بنا سکتے ہیں تو ان کا اتباع آج اس میں نہیں کہ ہم اس وقت بھی وہی منسوخ شدہ سکے کو لے کر بازاروں میں پھریں بلکہ وقت کے

ضروریات کے مطابق انگریزی زبان اور فنون جدیدہ (کمپیوٹر) کو پڑھنا پڑھاوہی درجہ رکھے گا جو اس زمانے میں فارسی زبان اور یونانی فلسفہ کا مقام تھا اگر آج اس حقیقت کو سمجھ کر ہمارے علمائے کرام فارسی زبان کی جگہ انگریزی زبان اور یونانی فلسفہ کی جگہ جدید سائنس کو دیں تو اس میں نہ علوم دینیہ کی تعلیم میں کوئی غلط تصرف اور نہ یہ اسوہ اسلاف ہی سے مختلف ہے مضر اسباب سے مکمل پرہیز کرتے ہوئے انگریزی زبان اور عصری علوم وفنون کو پوری کوشش اور توجہ سے حاصل کیا جائے تو وہ پچھلے منطق وفلسفہ سے زیادہ اسلامی عقائد اور اسلامی علوم کے خادم نظر آئیں گے''۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ حالات اور اس کے تقاضے بدل گئے دور حاضر کے تقاضوں کو سمجھ کر دورحاضر سے ہم آہنگ ایسا نصاب تیار کیا جائے جس کا اصل محور تو کتاب وسنت ہی ہو اور اصل اور فرع کا امتیاز باقی رکھتے ہوئے ماضی کی طرح آج کے رائج علوم کو نصاب کا جز بنایا جائے تو دین کی تفہیم وتشریح آسان ہوسکتی ہے اس لئے کہ مدارس میں زیر تعلیم طلبہ کی حیثیت داعی کی ہے اور عوام کی حیثیت مدعو کی ہے اور داعی قوم مدعو کی تشنگی کو اسی وقت دور کرسکتا ہے جب کہ داعی کے اندر ایسی صلاحیت ہو جس سے وہ اپنے دل کی آواز کو مدعو کے دل کے آواز بنادے اور اس کے لئے بہت سارے اسباب میں سے ایک سبب یہ بھی ہے کہ داعی کے پاس وہ زبان ہو جس سے مدعو واقف ہو اور اس حقیقت کے انکشاف کی چنداں ضرورت نہیں کے ایک طرف مدارس کے فضلاء کے پاس عربی فارسی سے مخلوط اردو زبان ہے تو دوسری طرف عوام کی زبان کی بیشتر حصہ انگریزی ہے کہ اکثریت کا اعتبار کرتے ہوئے اسے انگریزی زبان ہی کہہ دیا جائے تو شاید غلط نہ ہو، اور اس کے غلبہ کا سیلاب دن بدن ایسا بڑھتا جارہا ہے کہ مستقبل میں اسے ''مادری زبان'' کا درجہ مل جانے کے آثار نظر آرہے ہیں، لیکن جدید علوم اور انگریزی زبان کے اضافے کے ساتھ ساتھ فارسی اور منطق وفلسفہ کو نصاب سے بالکلیہ خارج کردینا بھی مناسب نہیں ہے اس لئے کہ ماضی میں ان کے غلبہ کی وجہ سے ہماری دینی کتابوں میں منطق وفلسفہ کے بہت سے اصطلاحات موجود ہیں اسی طرح بہت سی اہم اور مستند دینی کتابیں فارسی زبان میں ہیں اس لئے اپنے اسلاف کی تحریروں اور ان کے جمع کئے ہوئے علمی ذخیروں سے واقفیت کے لئے منطق وفلسفہ کی اصطلاحات اور فارسی زبان سے واقفیت ضروری ہے

اس لئے نصاب کی ترتیب نو میں "ا لضرورۃ تتقدر بقدر الضرورۃ " کے پیش نظر فارسی زبان اور منطق وفلسفہ کو بقدر ضرورت شامل کیا جائے اور ظاہر ہے کہ اس ضرورت کی تکمیل کے لئے فارسی زبان کو "رسمی طور" پر داخل کرنے کے بجائے اہمیت کے ساتھ پڑھنے اور پڑھانے کا انتظام انتہائی ناگزیر ہے اور موجودہ طرز تعلیم اس کے لئے ناکافی ہے رہی منطق وفلسفہ کی تو اس کی جتنی ضرورت اب باقی رہ گئی ہے اس کی تکمیل کے لیے منطق وفلسفہ کی چند ابتدائی کتابیں پڑھ لینا کافی ہے اور موجودہ زیر درس کتابوں میں سے صرف تیسر المنطق ،مرقات ،اور مبادی الفلسفہ سے اس ضرورت کی تکمیل ہوسکتی ہے۔

گویا آج ذمہ داری دہری ہے کہ ماضی کے ورثہ کی حفاظت اور حال و مستقبل کے تقاضوں اور ضرورتوں کی تکمیل دونوں ہمارے ذمے ہے اس لئے مزاج شریعت کی روشنی میں سنجیدگی کے ساتھ غور کرنا ہی اس مسئلہ کا حل ہے ورنہ علمی انحطاط کے اس سلسلہ کا منقطع ہونا مشکل ہے اور اس کا نتیجہ صرف یہ نکلے گا کہ اسلام کی غلط تشریح اور غلط اشاعت کو ہم محدود طریقے پر تو روک سکیں گے لیکن عالمی سطح پر اور وسیع پیمانے پر اسلام کی صحیح تصویر کو پیش کرنا ہمارے بس کی بات نہ ہوگی اور نئے شکار کے لئے ہمارے پاس پرانے بوسیدہ ناقابل انتفاع جال کے سوا کچھ اور نہ ہوگا ،اور حال میں ماضی کی غفلت کی سزا افسوس اور ندامت کی شکل میں جو ہمیں مل رہی ہے مزید اس میں اضافہ ہی ہوتا چلا جائے گا۔(۱)

(۱) muftiarifbillah.blogspot.com

# مبحث ثالث: ہندوستان میں مسلم بچوں کا تعلیمی مسئلہ

## سلطان وقت علم کے بوریہ نشین پر قربان ہوتا ہے

جونپور وہ سرزمین ہے جہاں تاریک کی چشم عبرت نے تخت سلطنت کو مسند علم کے سامنے جھکتے ہوئے اور سلطان وقت کو علم کے بوریہ نشیں پر قربان ہوتے ہوئے دیکھا، دنیا کی علمی تاریخ میں یہ واقعہ ہمیشہ یادرہے گا کہ جب ملک العلماء شیخ شہاب الدین دولت آبادی بیمار ہوئے اوران کی صحت سے ناامیدی ہوئی تو سلطان ابراہیم سلفی نے پانی کا پیالہ ان کے سر پر گھما کر خدا سے عرض کیا کہ ملک العلماء سے میری سلطنت کی رونق اور آب وتاب ہے اوران کی ذات خلق خدا کے لیے سرچشمۂ فیض ہے تو ان کی جگہ مجھے قبول فرما، اوران کو اٹھا کر میر سلطنت کو بے چراغ اور کم قیمت نہ کر، یہ دعا قبول ہوئی، ملک العلماء نے ابراہیم شرقی کی وفات (۸۴۴ھ) کے پانچ سال بعد (۸۴۹ھ) تک دنیا کو اپنے علم ودرس اور تصنیف وتالیف سے فیض پہنچایا۔ (۱)

## جونپور میں علم اور علماء

سلاطین شرقیہ کے اَسّی (۸۰) سالہ دور حکومت (۸۰۲-۸۸۱ھ) میں دہلی اور جونپور کے درمیان سیاسی زور آزمائی بھی جاری رہی اور علمی تقابل ومسابقت بھی پہلی کوشش کے نتیجے میں جونپور نے کوئی پائدار کامیابی حاصل نہیں کی، لیکن دوسرے مقابلے میں جونپور بارہا دہلی سے بازی لے گیا اور علماء دہلی نے علماء جونپور کی عظمت وعلمی تفوق کو تسلیم کیا سلطنت شرقیہ کے زوال کے بعد بھی علماء جونپور کا دور دورہ اوران کا علمی دبدبہ قائم رہا، دسویں صدی میں مولانا الہ دار جونپوری (م۹۲۳ھ) اور مولانا بہاؤالدین (م۹۱۱ھ) جیسے علماء کاملن اور گیارہویں صدی میں دیوان محمد رشید (م۱۰۸۳ھ) جیسا فاضل یگانہ ومرشد زمانہ ملامحمود جونپوری (م۱۰۶۲ھ) جیسا مجتہدفن اور یکتائے روزگار عالم نظر آتا ہے جس کی ''شمس بازغہ'' درس نظامی کے نظام شمسی میں بلندترین مقام رکھتی ہے بارہویں صدی میں جس طرح دہلی میں حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کی ذات میں بیک وقت مدرسہ وخانقاہ اور ہاتھ

(۱) نظام تعلیم مغربی رجحانات اوراس میں تبدیلی کی ضرورت، ص:۹۳-۹۴، مصنف: مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، مطبوعہ: سید احمد شہید اکیڈمی دارعرفات، تکیہ کلاں، رائے بریلی۔

میں جام شریعت اور سندان عشق نظر آتے ہیں اسی طرح اس صدی کی ابتداء میں جونپور میں دیوان محمد رشید کے خلف رشید بلکہ ارشد دیوان محمد ارشد (۱۱۱۳ھ) صاحب درس وصاحب ارشاد ہیں۔

تیرہوں صدی میں جونپور کو اس صدی کے مجدد حضرت سید احمد شہیدؒ کے دو جلیل القدر خلفاء حضرت مولانا سخاوت علیؒ اور مولانا کرامت علیؒ کے وجود پر ناز ہے اول الذکر نے جونپور اور باندہ میں برسوں درس وتدریس میں مشغول رہ کر صدہا جلیل القدر عالم اور مدرس پیدا کئے، اور ازلائے مشرقیہ میں عقائد واعمال کی اصلاح کا عظیم الشان کارنامہ انجام دیا، آخر الذکر بنگال کے وسیع اور پسماندہ خطہ نے دین کی روشنی اور علم کی چاشنی پائی، اعتماد کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ اس دور آخر میں کسی ایک شخص نے اتنے وسیع خطہ اور اتنی کثرت تعداد کو اپنی تبلیغی مساعی سے متأثر نہیں کیا، پھر جب مدارس کا دور آیا تو شیخ امام بخش کے مدرسہ حنفیہ نے نصف صدی تک علم کی شمع روشن رکھی، اور ہندوستان کے متعدد جلیل القدر علماء ومدرسین نے اس کو اپنے درس وتدریس سے رونق بخشی اس لئے جونپور اس وقت سے جب فیروز شاہ کے قت سے آزاد ہوا تھا اس وقت علم کی امانت اپنے سینے سے لگائے رہا اس گذشتہ تاریخ اور اس شاندار روایات کے بنا پر اس کو یہ استحقاق حاصل ہے کہ یہ اہم تعلیمی اجتماع اس کی سرزمین پر منعقد ہے، زمانے کے انقلابات نے دہلی اور جونپور کی سیاسی رقابت صدیوں پہلے ختم کردی تھی اور جونپور نے دسویں صدی ہی میں دہلی کی سیادت ومرکزیت تسلیم کرنے میں علم کی ترقی واشاعت میں اس وقت سے دہلی کی دوش بدوش اور قدم بقدم ہے۔(۱)

## جبری تعلیم: اندیشے اور نقصانات

ایک ایسے ملک میں جہاں مختلف عقائد، مختلف اخلاقی قدروں اور مختلف مذاہب کی قومیں آباد ہوں، تعلیم کا جبری اور عمومی نظام نافذ کرنے کے لیے بڑی وسعت نظر، وسعت قلب اور شدید احتیاط کی ضرورت ہے، ذرا سی بے احتیاطی، کم نظری یا عجلت کی کارفرمائی سے اس کا اندیشہ ہے کہ جن قوموں کو اپنے عقائد جان سے زیادہ عزیز ہیں ان کی زندگی میں ایک ایسی تلخی اور کوفت اور ایک ایسی ذہنی کشمکش پیدا ہوجائے جو اس ملک کی اخلاقی زندگی کے لیے کسی طرح بھی مفید نہیں، وہ یا تو ایسے نظام تعلیم کا مقاطعہ اپنا دینی فرض سمجھیں یا نہایت بزدلی اور ذہنی کشمکش کے ساتھ اس کو قبول کریں ایک نظام تعلیم کی یہ بہت بڑی ناکامی اور اس کے مرتب کرنے والوں کی بڑی غیر دانشمندی ہے کہ آبادی کی

(۱) مرجع سابق، ص: ۹۴-۹۵۔

ایک بڑی تعداد اس کا گرم جوشی اور مسرت کے ساتھ استقبال نہ کرے۔ (۱)

## دانشمندانہ طرز عمل

ایسے مختلف المذاہب اور مختلف العقائد ملک کے لیے سب سے زیادہ دانشمندانہ طرز عمل یہ ہے کہ اس ملک میں عمومی و جبری نظام تعلیم کو پوری شدت اور خلوص و دیانت داری کے ساتھ غیر جانبدارانہ اور نا مذہبی رکھا گیا ہے، اور اس کو آبادی کے کسی عنصر اور کسی فرقہ کے (خواہ وہ تعداد میں کتنا ہی غالب کیوں نہ ہو) عقائد و مذہبی روایات کا نمائندہ اور وکیل نہ بنایا جائے، ایسا ممکن ہے، اس وقت بھی دنیا کے بہت سے ملکوں میں ایسا ہو رہا ہے خود یورپ وامریکہ میں جہاں مذہبی احساس ہندوستان کی طرح تیز بھی نہیں ہے اس کا پورا لحاظ بھی رکھا جاتا ہے انگریزوں کا دور حکومت ہمارے لئے کسی طرح لائق تقلید اور قابل رشک نہیں لیکن اس بارے میں اس کی مثال دی جاسکتی ہے کہ اس دور میں نصاب کی کتابیں بالکل غیر جانبدارانہ اور نا مذہبی ہوتی تھیں اور ان میں کسی فرقہ یا قوم کی مخصوص چھاپ اور اس کے مذہب کی جھلک نہیں ہوتی تھی، یہی طرز عمل ہندوستان کے لیے ہر زمانہ میں مناسب ہے۔ (۲)

## تعلیم میں اخلاقی عنصر

البتہ اگر اخلاقی عنصر کو تعلیم کا جزبہ بنانے کا خیال ہے اور اس سے ذہنی اور اخلاقی تربیت حاصل کرنے کے مقصد سے یہ ضروری سمجھا جائے کہ بعض روحانی شخصیتوں، معلمین اخلاق، اور پیشوایان مذہب کا ذکر ہو تو پھر اس کا لحاظ ضروری ہے کہ پوری فراخ دلی کے ساتھ ان ناموروں اور اخلاقی و روحانی شخصیتوں کا تعارف ہو جن کی اخلاقی بلندی، پاکیزہ نفسی، روحانیت، خدمت خلق، سچی خدا پرستی اور انسانیت دوستی ایک مسلمہ تاریخی حقیقت ہے خواہ وہ اپنے عقائد و اعمال کے لحاظ سے کسی مذہب سے تعلق رکھتے ہوں ان دو راستوں (ایک کامل غیر جانبداری و نامذہبیت، اور ایک مکمل رواداری و بے تعصبی) کے علاوہ اس ملک کے لیے کوئی تیسرا راستہ نہیں ہے۔

## حیرت اور مایوسی

اس معیار سے جو ہر طرح عادلانہ و عاقلانہ اور جس کی پشت پر اصول تعلیم اور انسانی نفسیات کے دلائل کا ایک دفتر اور تاریخی واقعات اور حقائق کا ایک لشکر ہے جب ہم اپنی نامذہبی (Sccular)

(۱) مرجع سابق، ص: ۹۷-۹۸

(۲) مرجع سابق، ص: ۹۸۔

ریاست کے نامذہبی نظام تعلیم ونصاب تعلیم کو جانچتے ہیں تو ہم بڑی مایوسی اور حیرت ہوتی ہے، ان کو صاف نظر آتا ہے کہ ان دوراستوں میں ہندوستان کی نوخیز جمہوری حکومت کے لیے ہر طرح موزوں ومناسب تھے، کوئی راستہ اختیار نہیں کیا گیا ہے، بلکہ ایک تیسرا راستہ اختیار کیا گیا ہے جو اس ملک کے لیے بھی مناسب نہیں ہے جس میں کبھی کبھی نامذہبی ہونے کا اعلان نہ کیا ہو چہ جائے کہ وہ ملک جو اپنے دستور میں بار بار نامذہبی ہونے کا اعلان کرتا ہے۔

## دیومالائی اثرات

ہم ایک طرف نصاب تعلیم کی وہ کتابیں دیکھتے ہیں جس میں صاف صاف اور نمایاں طور پر ایک ہی فرقہ اور ایک عنصر کی مذہبی روایات، تاریخی شخصیات اور قدیم علم الاصنام (دیومالا Mythology) کے اسباق ہیں ان اسباق میں ان عقائد وتخیلات کو پیش کیا گیا ہے جو کم سے کم مسلمانون کے بنیادی عقائد (توحید ورسالت) سے صرف یہی نہیں کہ مطابقت نہیں رکھتے، بلکہ ان کی تردید کرتے ہیں، مسلمان بچہ جو ان سرکاری اسکولوں میں تعلیم پانے پر مجبور اور دوسرے ذرائع تعلیم سے عام حالات میں محروم ہیں، تعلیم اور نوشت وخواند کے نام سے ایسے عقائد وتخیلات قبول کرتا ہے جو ان بنیادوں سے متصادم ہیں جن پر اس کے مذہب کی عمارت قائم ہیں اور جن کا اعتقاداً قبول کر لینا اس کے لیے ذہنی واعتقادی ارتداد کے مرادف ہے، اگر اس کا ذہن سلیم ان کے قبول کرنے سے انکار کرتا ہے یا اس کے گھر کا ماحول اور تعلیم اس کی تردی کرتی ہے (جس کی موجودہ حالات کی لحاظ سے بہت کم توقع ہے) تو اپنے نصاب کی بے وقعتی اور غیر معقولیت کا قائل ہوتا ہے اور خود ایک کشمکش اور ذہنی الجھن میں گرفتار ہو جاتا ہے یہ دونوں نتیجہ کسی نظام تعلیم کے لیے اچھے اور قابل قبول نہیں، نہ یہ کہ بچہ جو مدرسہ میں اپنے والدین کی امانت ہے، اپنے والدین کی عقائد اور اپنے مذہب کے بنیادی حقائق سے باغی ہو جائے، نہ یہ کہ وہ تعلیم بھی حاصل کرتا رہے اور اس کی فطرت سلیمہ اس کے قبول کرنے سے انکار بھی کرتی رہے، اور اس کو وہ بعید از قیاس اور نا قابل فہم بھی معلوم ہوتے رہیں۔

## حکومت کی زیرنگرانی تیار کردہ نصاب میں جانبدارانہ طرز عمل

دوسری طرف آپ اردو کی وہ سرکاری کتابیں دیکھئے جو مختلف تعلیمی منزلوں کے لئے تجویز کی گئی ہے، اور حکومت کے زیرنگرانی تصنیف ہوئی ہے، ان میں صرف ایک فرقے اور ایک مکتب خیال کی نمائندگی کی گئی ہے، اور صرف اس کی روایات، تقریبات اور مذہبی وتاریخی وسیاسی شخصیات (Heroes) کا

انتخاب کیا گیا ہے، اور کس طرح دوسرے فرقوں اور جماعتوں (Communities) کی نامور شخصیتوں، قابل ذکر تقریبوں اور زندگی کے اچھے پہلوؤں کو نظر انداز کیا گیا ہے، میں آپ کے سامنے صرف ایک نمونہ پیش کرنا چاہتا ہوں۔

یوپی کے محکمۂ تعلیم نے اردو کی جو بیسک ریڈریں تیار کرائیں ہیں، ان میں بزرگوں اور شخصیتوں کے سلسلے میں صرف شری رام چندر جی، شری کرشن جی، نسورداس، تلسی داس، میرا بائی کے متعلق اسباق ہیں، تیرتھوں اور مذہبی مقدسات میں صرف اجودھیا، متھورا، کاشی، پریاگ، گنگا، رامائن کا تذکرہ ہے، تاریخی واقعات میں سے بھرت ملاٹ، دھنش یگ پر ہلاد کا انتخاب کیا گیا ہے، رہنماؤں اور لیڈروں میں مہاتما گاندھی، پنڈت جواہر لال نہرو، اشور چند ودیا ساگر، مدن موہن، مالوی تلک، لالہ لاجپت رائے، سردار پٹیل، راجندر پرشاد، سروجنی نائڈو، پنڈت پنت، ٹنڈن جی کا نام ملتا ہے، پورے سلسلے میں کہیں کسی مسلمان شخصیت، کسی اسلامی تقریب، کسی تاریخی روایت حتیٰ کہ جنگ آزادی کے بھی کسی مسلمان قائد اور رہنما کا بھی تذکرہ نہیں ہے، اگرچہ اس سلسلے میں منگل پانڈے، تانتیا ٹوپی اور بھگت سنگھ تک کو فراموش نہیں کیا گیا ہے۔

## ایک کھلی ناانصافی

میں یہ عرض کروں گا کہ یہ صرف مسلمانوں کے ساتھ ناانصافی نہیں ہے، بلکہ ہندوستان کے ساتھ بھی بڑی ناانصافی ہے، کہ اس کو خواجہ معین الدین اجمیریؒ جیسے کامل انسان، مخدوم شرف الدین یحیٰی بہاریؒ جیسے خدا شناس، نظام الدین اولیاءؒ جیسے سچے خدا پرست، ناصرالدین جیسے درویش صفت بادشاہ، شیر شاہ سوری جیسے اعلی مدبر و منتظم، امیر خسرو جیسے شاعر خوشنوا فخر ہندوستان، عبدالرحیم خان خاناں جیسے جامع کمالات انسان، شاہ ولی اللہ محدثؒ جیسے حکیم وفلسفہ، ٹیپو سلطان جیسے غیور بلند ہمت انسان کی پیدائش اور پرورش کے شرف سے محروم کر دیا جائے، جن کی وجہ سے ہندوستان کا پایہ سارے مشرق اور پورے ایشیا میں بلند ہے، اور بڑے بڑے اہل کمال کا سر عقیدت اس کے آگے خم ہے، یہ نئی نسلوں کے ساتھ بھی ناانصافی ہے، کہ ان کو انسانیت کی ان تابناک مثالوں اور ہندوستان کے ان سرمایۂ فخر فرزندوں کے نام اور کام سے واقف ہونے کا موقع نہ دیا جائے، جن کی زندگی صرف اسی ملک کے لئے نہیں، دنیا کے تمام نوجوانوں کے لئے قابل دید، اور ان کا کردار انسانی سیرت کا تعمیر اور شخصیت کی تکمیل کے لئے ایک بیش بہا طاقت ہے۔

## ایک اہم مسئلہ

نصاب کی یہ نوعیت، نظام تعلیم کا یہ جارحانہ رجحان اور اس کے مرتبین کی یہ کوتاہ نظری مسلمانوں کی قومی زندگی کا سب سے اہم اور دشوار مسئلہ بن گیا ہے، دوسرے معاشی وسیاسی مسائل اس مسئلہ کے مقابلہ میں ہیچ ہیں، مسلمانوں کو جب تک اس کی طرف سے اطمینان نہ ہو کہ اس کی آئندہ نسلیں اسلام پر قائم رہیں گی، اور یہ آپ کو معلوم ہے کہ اسلام کسی قومیت اور نسل کا نام نہیں، وہ عقائد واعمال کے مجموعے کا نام ہے، اس وقت مسلمان ایک شدید ذہنی کشمکش میں مبتلا رہیں گے اور ان کو اپنے مستقبل کے طرف سے وہ اطمینان وسکون حاصل نہیں ہوگا، جو اس قوم کے لئے ضروری ہے، جو اپنے ماضی کے اعتبار سے بھی اور موجودہ صلاحیت اور تعداد کے اعتبار سے بھی کسی ملک کی تعمیر وترقی کا اہم عنصر ہے، مجھے معلوم ہے آپ حضرات بے خبر نہ ہوں گے کہ حساس مسلمانوں کا ایک طبقہ شدید کشمکش میں مبتلا ہے، اسی کشمکش کا نتیجہ وہ تاریخی کنونشن ہے جو تعلیم کے مسئلہ پر غور کرنے کے لئے ممبئ میں منعقد ہوا، اور جس میں سارے ملک سے مسلمانوں کی مختلف الخیال جماعتوں اور اداروں نے شرکت کی، بہت سے مسلمان اس مسئلہ کے حل سے مایوس ہوکر یا مستقبل کی خطرناکی کو دیکھ کر اس ملک کو چھوڑ دینے پر غور کرنے لگے ہیں، میرے اور آپ کے لئے یہ کوئی راز کی بات نہیں ہے کہ بہت سے خاندانوں نے محض اس ملک کو اسی وجہ سے خیرآباد کہہ دیا، میں اس شکست خوردہ ذہنیت کا سخت مخالف ہوں، اور اس کو مسئلہ کا حل بالکل نہیں سمجھتا، اس کو اس عظیم تعداد کے ساتھ بے وفائی بھی سمجھتا ہوں، جس کو اس ملک میں رہنا ہے، لیکن اس سے بہرحال مسلمانوں کی شدت احساس اور تلخی احساس کا اظہار ہوتا ہے، اور ہمیں سنجیدگی کے ساتھ اس واقعہ پر غور کرنا چاہئے۔

## خلاف عقل وعدل تعلیمی صورتِ حال اور اس کا مقابلہ

اس صورت حال کا مقابلہ جو خلاف عقل بھی اور خلاف عدل بھی، جو مسلمانوں کے ملی وجود کے لئے بھی خطرہ ہے اور ہندوستان کی سیاسی قوت وعظمت کے لئے بھی، دوطرح سے ممکن ہے، ایک یہ کہ پوری قوت وجرأت کے ساتھ اس کا مطالبہ کیا جائے کہ ہماری نا مذہبی ریاست کا نظام تعلیم پوری دیانت داری کے ساتھ نامذہبی ہو، اس نصاب تعلیم سے وہ تمام اجزاء خارج کیے جائے جو مذہبی اور کسی خاص فرقہ کی تعلیمات وعقائد وتاریخ کی نمائندگی کرتے ہیں، یہ بنیاد ہر طرح معقول ومستحکم ہے آپ جو اس ملک میں قیام کا فیصلہ کر چکے ہیں جو یہاں پیدا ہوئے اور یہاں کے شہری ہیں جو حکومت کے

محاصل ومطالبات ادا کرتے ہیں، جن کو حق رائے دہندگی حاصل ہے، جو حکومتوں اور وزارتوں کی تشکیل میں دخیل ہیں، جن کو کوئی حکومت اور سیاسی پارٹی نظر انداز نہیں کر سکتی، جن کی رائے وتعداد کا پاسنگ اور ہر پلڑے کو جھکا سکتا ہے، ان کو تمام خصوصیتوں سے قطع نظر محض ہندوستانی وشہری ہونے کی بناء پر بھی اس کا حق ہے وہ اس کا مطالبہ کرے کہ اس ملک کا نظام تعلیم اور نصاب تعلیم ان کے بنیادی عقائد اور ان کے مذہبی جذبات وضروریات کے مطابق ہو، یہ کم سے کم ان کو مجروح کرنے والا اور ان کو چیلنج کرنے والا نہ ہو، اس مطالبہ میں ہندوستان کے تمام معقولیت پسند عناصر آپ کی تائید کریں گے، اور یہ صورت حال جس میں زیادہ دن باقی رہنے کی صلاحیت نہیں ہے اور جو بالکل غیر طبعی اور خلاف فطرت ہے، جلد تبدیل ہو جائے گی، لیکن اس کے لئے اس کی ضرورت ہے کہ یہ حقیقت واضح ہو جائے کہ یہ مسئلہ آپ کی زندگی کا اہم ترین مسئلہ ہے، اور آپ کے لئے مذہبی وروحانی طور پر موت اور زندگی کا سوال ہے اور آپ کے اس کے مقابلہ میں کوئی اور متوازی راستہ نہیں ہے۔[1]

(۱) مرجع سابق، ص:۱۰۲-۱۰۳

# مبحث رابع: نظام تعلیم میں نظر ثانی کی ضرورت

## تعلیم کا مسئلہ ایک سنجیدہ مسئلہ ہے

تعلیم کا مسئلہ اپنے اندر پہاڑی دریاؤں اور آبشاروں جیسا شور نہیں رکھتا، اس کے لئے وقت اور مقالات وتقاریر کی پیمائش کے لیے کوئی فیتہ مناسب نہیں، جس سے اس کو ناپا جائے اور مقرروں کو اس کا پابند بنایا جائے، اس کے لیے تو ایک علمی مذاکرہ یا خاص قسم کا سمینار یا سمپوزیم مناسب تھا، آپ حضرات اس کانفرنس کی نشستوں اور مختلف جلسوں میں شرکت کر کے تھک گئیں ہیں، اس کے لیے یہ وقت بھی مناسب نہیں ہے اس صورت میں تعلیم جیسے سنجیدہ اور غور طلب مسئلہ پر غور کرنے کے لیے وہ مناسب ماحول اور پرسکون فضا میسر نہیں جو اس کا حق ہے۔(۱)

## نظام تعلیم کی ثنویت

ایک بہت بڑا مسئلہ ہمارے نظام تعلم کی دوئی یا ثنویت ہے یعنی دو متوازی نظام تعلیم کا کسی ملک یا معاشرے میں نافذ ہونا، اس معاشرے کی سب سے بڑی بدقسمتی ہے، اور یہ اس کو بہت غیر ضروری مشکلات میں مبتلا کر دینے کے لیے کافی ہے، اس مسئلہ پر ہندوستان کے اہل فکر نے، اور ہندوستان کے باہر مشرق وسطی کے مفکرین نے اظہار خیال کیا ہے، جہاں تک مجھے معلوم ہے ہندوستان میں سب سے پہلے مولانا سید مناظر احسن گیلانی صاحب نے اس مسئلہ پر اظہار خیال فرمایا، مصر کے ایک عرب فاضل بڑے تجربہ کار معلم ڈاکٹر محمد یوسف موسیٰ نے پہلی مجلس اور پہلی ملاقات میں اس پر گفتگو کی، حقیقتاً یہ مسئلہ ایسا ہے کہ اس پر بہت اطمینان کے ساتھ تبادلۂ خیال ہونا چاہئے، میں یونس سلیم صاحب کی معلومات میں اضافہ کرنے کا دعویٰ نہیں کرتا، لیکن شاید اپنے بہت سے قارئین کی معلومات میں اضافہ کرسکوں کہ ہمارا قدیم نصاب تعلیم اس عیب سے بری تھا۔

## درس نظامی

آپ کو معلوم ہے کہ ہندوستان میں جو نظام تعلیم تک چلا اور جس کو آخری دور میں درس نظامی سے موسوم کیا جانے لگا، اس کو ترکستان وایران میں بھی قبول کیا گیا، اس میں بھی کسی قسم کی تقسیم نہیں

(۱) مرجع سابق، ص:۶۸۔

تھی، وہ نظام تعلیم یہاں ہر قسم کی ضرورت کے اشخاص پیدا کرنے کا ذمہ دار تھا، یعنی وہ جہاں علماء وفقہا اور مفتی پیدا کرتا تھا، اور اس وقت کی سلطنت کو قاضی اور ماہرین فقہ مہیا کرتا تھا، وہاں ایڈمنسٹریشن اور سول سروس کے ماہرین بھی تیار کرتا تھا، اس نظام تعلیم کے علاوہ کوئی دوسرا نظام تعلیم اس ملک میں موجود نہیں تھا خاص قسم کے اشخاص پیدا کرے، ان تمام تمدنی، تعلیمی، اخلاقی اور اجتماعی ضروریات کے لیے ایک ہی نظام تعلیم پر انحصار تھا، لیکن یہ صورت حال انگیریزوں کے داخلہ کے بعد قائم نہیں رہی، اور ظاہر ہے کہ وہ اس نظام تعلیم کو قبول نہیں کر سکتے تھے، وہ ایک نیا نظام تعلیم اس ملک کے لیے لائے، اور اب تقریباً دنیا کی تمام ممالک میں دو متوازی نظام تعلیم جاری ہیں، یہ ذہنی انتشار اور جو کشمکش آپ کو معاشرہ میں نظر آتی ہے، جس کے مظاہر ہم کو زندگی کے مختلف شعبوں میں نظر آتے ہیں، یہ اس دوئی اور اسی دو متوازی نظام تعلیم کا نتیجہ ہیں۔

## ساری دنیا کا نظام تعلیم اصلاح طلب ہے

جہاں تک نظام تعلیم کا تعلق ہے، تقریباً ساری دنیا کا نظام تعلیم اصلاح طلب ہے، وہ بڑی حد تک اپنی افادیت کھو چکا ہے۔

آپ امریکہ و یورپ اور دنیا کے تمام ترقی یافتہ ممالک میں دیکھیں گے، نہ صرف نظام تعلیم سے بلکہ نظام تعلیم نے بنیاد تخیل سے عام بے چینی پائی جاتی ہے، اور یہ محسوس کیا جاتا ہے کہ یہ نظام تعلیم اب بہت کچھ فرسودہ اور Out of Date ہو چکا ہے، ان میں ہمیں نئی روح ڈالنی چاہئے، اور از سر نو اس کی تشکیل ہونی چاہئے، لیکن ابھی تک دنیا کے کسی حصہ میں بھی کوئی ایسا انقلابی اور جرأت مندانہ قدم نہیں اٹھایا گیا، اور یہ ایک ایسا سلسلہ ہے، جو بغیر سوچے سمجھے رواں دواں ہے۔

## معاشیات وسیاسیات کی طرف ضرورت سے زیادہ توجہ

اس عہد میں معاشیات اور سیاسیات نے اتنی اہمیت اختیار کر لی ہے اور وہ فکری قویٰ اور سوچنے سمجھنے کی صلاحیت پر اس طرح حاوی ہو چکے ہیں کہ تعلیم کا مسئلہ جس توجہ کا مستحق تھا، اتنی توجہ اس پر نہیں کی گئی۔

## علامہ اقبال کا نظریہ

جہاں تک تقلید اور فرسودگی و کہنگی کا تعلق ہے، اور جہاں تک اصلاح طلب ہونے کا سوال ہے اس میں جدید اور قدیم نظام تعلیم کا کوئی فرق نہیں ہے، اور میں سمجھتا ہوں کہ اقبال مرحوم نے اپنا جب

یہ مصرع کہا تھا:

کند مکتب رہ طے کردہ را طے

تو اس سے مراد کوئی مکتب نہیں تھا جو مسجد میں کام کرتا ہے، بلکہ آپ کو معلوم ہے کہ ان کی اصطلاحی ''دانش گاہ'' کے لیے مکتب اور مدرسہ کی ہے وہ جب مکتب کا لفظ بولتے ہیں تو ان کی مراد دانش گاہ ہوتی ہے، تعلیم دینے کا مرکز، خواہ وہ کوئی یونیورسٹی اور کالج ہو، یا عربی کا مدرسہ اور دارالعلوم۔

اقبال نے آج سے نصف صدی پہلے جو بات سادے الفاظ میں کہی تھی: ع

کند مکتب رہ طے کردہ را طے

مکتب سے جو سبق روز اول سے پڑھا تھا ابھی تک وہ اس کو دہرائے چلا جا رہا ہے، جو راستہ طے ہو چکا ہے وہ اس کو طے کر رہا ہے، یہ صورت حال کی صحیح عکاسی کرتا ہے۔

## اقبال کے الفاظ میں ایک شکوہ

جہاں تک نظام تعلیم کا تعلق ہے وہ ایسے Radical Change ایسے بنیادی انقلاب اور ایک ایسے جرأت مندانہ اقدام کا طالب ہے جس کے اندر جرأت بھی ہو، ذہانت بھی ہو، وسعت بھی ہو، میں اقبال کے الفاظ میں شکوہ کروں گا اور کم سے کم جہاں تک ہندوستان کا تعلق ہے، یہ عرض کروں گا:

ہند میں حکمت دیں کوئی کہاں سے سیکھے — نہ کہیں لذت کردار نہ افکار عمیق
حلقۂ شوق میں وہ جرأت اندیشہ کہاں — ہائے محکومی وتقلید و زوال تحقیق
ان غلاموں کا یہ مسلک ہے کہ ناقص ہے کتاب — کہ سکھاتی نہیں مومن کو غلامی کے طریق

تو واقعہ یہ ہے کہ اس وقت جہاں تک عربی مدارس کا تعلق ہے، میں اس کا ایک حقیر خادم ہوں، مجھے یونس سلیم صاحب کے گلہ کا کوئی گلہ نہیں، میں ان کے ان تعلقات سے واقف ہوں جو نہ صرف مدارس سے؛ بلکہ ان کے خادموں میں ہیں اور آج کے نہیں بہت دیرینہ ہیں، میں ان کے اس گلہ کو قبول کرتا ہوں کہ ان مدارس میں تبدیلی کی ضرورت ہے، لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی کہوں گا کہ پورا نظام تعلیم از سر نو بدلنے کے قابل ہے، اور کوئی شخص کی زندگی پر نظر ہے، زندگی کے بدلتے ہوئے وسائل اور اس کی تیز رفتاری پر نظر ہے، وہ اس کا انکار نہیں کر سکتا کہ اس طرح سے قدیم مدارس زندگی سے الگ ہو گئے ہیں، وہ زندگی سے کچھ زیادہ ہم آہنگ نہیں ہیں، اسی طرح ان یونیورسٹیوں کے گریجوٹ اور فضلائے زندگی میں اپنا وہ مقام معین نہیں کرا سکے اور اپنی افادیت کا ایسا ثبوت نہیں دے سکے جتنا ثبوت انھیں دینا چاہیے۔

## اسلامیات پر مزید توجہ کی ضرورت

جہاں تک تعلق ہے اسلامیات پر کام کرنے کا، میں یہ عرض کروں گا کہ اس وقت تک اس پر بہت کچھ کام ہو چکا ہے، بے شک مسئلہ کی نوعیت ایسی ہے کہ کسی کام کو حرف آخر نہیں کہا جا سکتا، یہ زندگی کی تعریف ہے، کوئی برائی یا عیب نہیں اسی سے زندگی کہلانے کی مستحق ہے، کہ وہ کسی جگہ ٹھہرتی نہیں، وسائل اور اس کے مطالبات بدلتے رہتے ہیں، ان کے جواب دینے کی ضرورت ہے، میں نہایت ادب کے ساتھ عرض کرونگا کہ انھوں نے صورت حال کی جو تصویر پیش کی ہے، اس میں حقیقت کم ہے، اور شاید وہ ان کام کرنے والوں کے ساتھ پورا انصاف نہیں کر سکے، ایسا نہیں ہے، ان مسائل پر بہت وقیع لٹریچر پیدا ہو گیا ہے، لیکن ان کی اشاعت اور پبلسٹی کا کام جس پیمانہ پر ہونا چاہئے، اس میں ضرور کمی ہے۔

ہمارے علماء کے متعلق آج سے پچاس برس پہلے کہا گیا تھا، بعینہ آج بھی دہرا دیے جاتے ہیں، لوگوں کی باتوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ لوگوں نے اپنے حافظہ پر زیادہ اعتماد کیا ہے، اور ذہن پر کم، مجھے افسوس ہے، کہ ہمارے بہت سے احباب پوری صورت حال سے واقف نہیں ہے، وہ نہیں جانتے کہ کن کن گوشوں میں کیسی کوششیں کی جارہی ہیں، جہاں تک مستشرقین کا تعلق ہے، ان کی تردید یا ان کے اٹھائے ہوئے سوالات کے جواب میں بہت فکر انگیز لٹریچر پیدا ہو رہا ہے، اس کا جائزہ لینا بھی بڑا اہم کام ہے، جو ہر شخص کے لیے آسان نہیں ہے، ایسا نہیں ہے کہ ان چیزوں کو بالکل اچھوت چھوڑ دیا گیا ہو اور ان کی طرف بالکل توجہ نہیں دی گئی، کہ ندوۃ العلماء نے بے شک اپنے مقاصد میں اس حد تک کامیاب نہیں ہو سکا جس حد تک اس کے روشن ضمیر بانیوں نے سوچا تھا، اس کے بہت سے تاریخی، اقتصادی اور سیاسی اسباب ہیں، کوئی شبہہ نہیں کہ اس نہ یہ آواز بلند کی تھی، وہ آواز اب بھی بڑا وزن رکھتی ہے، اور باوجود اس کے کہ اس پر ستر برس گزر چکے ہیں، اس میں کہنگی اور فرسودگی پیدا نہیں ہوئی۔

## نظام تعلیم کے لیے ایک نئے اجتہاد کی ضرورت ہے

میں یہ عرض کروں گا کہ نظام تعلیم کے لیے ایک نئے اجتہاد کی ضرورت ہے، اور اس اجتہاد کا دامن صرف دینی مدارس تک نہیں رہنا چاہئے، بلکہ پورے نظام تعلیم کو اس کو اپنے سایۂ عاطفت میں لینا چاہئے، اور یہ سمجھتے ہوئے کہ انسانوں کے لیے جو چیز پیدا کی جائے وہ کسی زمانے میں بھی حرف آخر نہیں ہو سکتی، یہ صرف وحی الٰہی کی خصوصیت ہے، باقی یہ مشرق کی خصوصیت ہے نہ مغرب کی، اور

قدیم و جدید کی تقسیم میں اقبال کے الفاظ میں دلیل کم نظری ہے، اس میں مشرق ومغرب کی کوئی تخصیص نہیں، اسلام ایک ابدی پیغام ہے، اس کا زندگی سے تعلق ہے، اور جس چیز کا زندگی سے تعلق ہو اس کو زندگی کے ہر وقت کا جائزہ لیتے رہنا چاہئے، اور تعلیم کے پورے مسئلہ کو اپنی نگرانی اور احتساب میں لینا چاہئے، اور اس میں کسی کی رعایت نہ کرنی چاہئے۔

## فن تعلیم اور نظام تعلیم کے اصول

جہاں تک فن تعلیم اور اس کے اصولوں کا تعلق ہے، میں ان محنتوں کی قدر کرتا ہوں جو تعلیم کے اصول اور نظام تعلیم کے آداب اور تجربات کے بارے میں کی گئی ہیں، جو کتب خانہ اصول تعلیم پر اس وقت تک تیار ہو گیا ہے، وہ ہمارے قدر واعتراف کا مستحق ہے؛ لیکن فن تعلیم وہ مبحث وموضوع ہے جو کبھی ختم نہیں ہو سکتا، اس میں پرانے تجربات اور رہنما اصولوں سے زیادہ عقل سلیم (Common Sense) اور اس مسئلہ سے مناسبت کی ضرورت ہے۔

اگر کسی جگہ تمام ماہرین تعلیم جمع ہو جائیں اور انہیں اس موضوع پر اظہار خیال کا موقع دیا جائے، تب بھی یہ نہیں کہا جا سکتا کہ انہوں نے اس مسئلہ کا احاطہ کر لیا گیا ہے، اس کو بہر حال ہمیں معلمین اور اساتذہ کے ذوق سلیم، اپنے موضوع سے محبت اور شیفتگی پر اور نوجوانوں کی نفسیات شناسی پر چھوڑنا پڑے گا، اور اسی پر اعتماد کرنا پڑے گا، یہ تعلیم کس طرح ہو؟ کس طرح اپنے موضوع کی محبت پیدا کر دی جائے؟ جس مذہب کی تعلیم دی جارہی ہے اس مذہب سے کس طرح وابستگی پیدا کی جائے؟ اور اس کے اندر کس طرح اس مذہب پر اعتقاد راسخ کیا جائے؟ کس طرح اس کی سیرت کی تشکیل ہو اور ان کا کیریکٹر بنایا جائے؟ کس طرح ان کو نفس کی مادی ترغیبات اور زمانہ کی خارجی اثرات سے بچایا جائے؟ مادیت اور دین وایمان کے درمیان جو ایک عالم گیر معرکہ درپیش ہے ان کے اندر کس طرح ایسی قوت پیدا کی جائے کہ وہ اس معرکہ سے کامیاب ہو کر نکل سکیں؟

## استاذ کو فن تعلیم سے فطری مناسبت ہو

اس کے لیے کسی اصول تعلیم پر لکھی ہوئی کسی ایک کتاب پر انحصار نہیں کیا جا سکتا، اس میں دو چیزوں کی شرط ہے:

ایک تو یہ کہ استاذ کو فن تعلیم سے فطری مناسبت اور خداداد ذوق ہو وہ معلم پیدا ہوا ہو، اور اگر وہ معلم پیدا نہیں ہوا تو کم از کم اس نے اپنے موضوع سے اتنی مناسبت پیدا کر لی ہو کہ اس کو انگلی پکڑ کر

چلانے کی ضرورت نہ ہو۔

## استاذ مجتہد ہو

یہ اصول ہمیشہ تسلیم کیا گیا ہے اور قیامت تک تسلیم کیا جائے گا کہ معلم درحقیقت مجتہد ہوتا ہے اسکولوں میں دینیات کے لیے لگے بندھے اصول ہمیشہ کام نہیں دے سکتے اور نہ استاذ کو آپ اس کا پابند بنا سکتے ہیں، استاذ میں دل و دماغ سے سوچنے اور راستہ پیدا کرنے کی صلاحیت ہونی چاہئے، وقت پر اس کو ایسا معلوم ہو کہ الہام ہوا ہے، مجھے ایک عرب ماہر تعلیم کا یہ جملہ بہت پسند آیا: ''لا یکون المعلم معلما حتی یکون ملھما'' کوئی استاذ اس وقت تک حقیقی معلم اور استاذ نہیں ہو سکتا جب تک کہ اس کو القاء نہ ہوتا ہو، اس کو یہ نہ محسوس ہوتا ہو کہ کوئی چیز اس وقت اس کے دل میں ڈالی گئی ہے؛ اس لیے کسی استاذ کو محض طفلِ مکتب فرض کرلیا جائے کہ وہ ہر ہر چیز دیکھ کر عمل کرے، پہلے وہ کتاب دیکھے، پھر بچوں کو یا طلبہ کو پڑھائے اس بارے میں تو خود اس پر اعتماد کرنا پڑے گا، اگر اس میں بات میں بات پیدا کرنے اور اپنا راستہ خود نکالنے کی صلاحیت نہ ہو تو وہ کبھی کامیاب استاذ نہیں ہو سکتا۔

## استاذ داعی ہو

دوسری شرط یہ ہے کہ استاذ داعی ہو، جس موضوع کی تعلیم وہ دینا چاہتا ہے وہ اس کا مجسم نمونہ ہو، ان کی زندگی اس کا پرتو ہو؛ بلکہ زندگی اس پرتو کامل ہو، وہ جب سامنے آئے تو معلوم ہو کہ مسلمان ایسا ہوتا ہے، ایک معلم کا اخلاق ایسا ہوتا ہے، ایک ایثار پیشہ آدمی ایسا ہوتا ہے، ایک پاکباز اور نیک سیرت انسان ایسا ہوتا ہے، ان کی تلقین اور عمل میں کلی مطابقت ہو اور ان کے چہرے کا نور بتاتا ہو کہ سراپا عصمت و صداقت ہیں، یہ سراپا اخلاص ہے، ان کے علم میں وسعت بھی ہے اور گہرائی بھی۔

## کامیاب معلم

ایک مرتبہ ڈاکٹر ذاکر حسین خان صاحب مرحوم سے جبکہ وہ علی گڑھ یونیورسٹی کے وائس چانسلر تھے میں نے یہ عرض کیا تھا کہ مجھے ہمیشہ سے اس کے بارے میں بڑا تردد رہا کہ دینیات کے لیے ایسے معلمین کا انتخاب کیا جائے جو معاشی اور علمی حیثیت سے پسماندہ ہوں، زندگی کے دھارے سے بالکل الگ ہوں، اور یہ سمجھا جاتا ہو کہ وہ دینیات کے سوا کچھ نہیں جانتے، ایسے مولویوں کا انتخاب کیا جائے جن کا معاشرے میں بھی کوئی اونچا مقام نہ ہو، اور نوجوان ان کو زندگی سے علیحدہ دیکھتے ہوں، اور ان کا کوئی خاص احترام نہ ہو، زندگی کے مسائل سے بھی ان کو زیادہ ربط نہ ہو، میں نے کہا کہ اگر

آپ کو فلاسفی ڈپارٹمنٹ یا آرٹس اور سائنس ڈپارٹمنٹ سے ایسے اساتذہ مل سکیں جو اسلام پر پورا عقیدہ رکھتے ہوں، دینیات سے بقدر ضرورت واقفیت رکھتے ہوں وہ زیادہ اثر انداز ہو سکتے ہیں، مجھے یہ معلوم ہے کہ مسئلہ اس آسانی سے طے کرنے کا نہیں ہے، اس میں بہت سی عملی، ٹیکنیکل اور وقتی دشواریاں ہیں، ان پر بحث کرنے کے لیے زیادہ وسیع وقت چاہئے۔

میں یہ ضرور عرض کروں گا کہ معلمین کے انتخاب میں اس بات کو ضرور پیش نظر رکھنا چاہئے کہ ان کا نہ صرف اخلاقی اثر ہو بلکہ ان کا ذہنی تفوق بھی قائم ہو، وہ مسائل کو سمجھتے ہوں، زندگی کے مسائل سے باخبر ہوں، وہ زندگی کے کنارے نہ ہوں بلکہ بیچ منجدھار میں ہوں، وہ عہد گزشتہ کے انسان نہ ہوں بلکہ اسی عہد اور اسی دور کے انسان ہوں، اگر ادب وشاعری اور فنون لطیفہ کا مسئلہ چھڑ جائے، سیاسی مسئلہ موضوع بحث ہو، تو اس پر وہ آزادانہ رائے دے سکیں اور اپنی واقفیت کا نقش قائم کر سکیں، اور ان کے دل و دماغ میں ایک چنگاری فروزاں ہو، وہ طالب علم کو اپنے جیسا بلکہ اپنے سے اچھا بنانا چاہتے ہوں، ان کی غذا، ان کی دوا، ان کے دل کی تسکین اور ان کی زندگی کے لیے جواز ہی یہ ہو کہ وہ اپنے عقیدہ کو اپنے عزیز طلبہ، اپنے لخت جگر جو ملت کے لخت جگر ہیں ان میں منتقل کر دیں، ان کو اگر روکا جائے اور ان کے پاؤں میں بھاری بیڑیاں ڈال دی جائیں اور ان کی زبان پر مہر لگا دی جائے پھر بھی وہ بے تاب ہوں اس بت خانہ میں اذان دینے اور صنم کدہ میں حق کی آواز بلند کرنے کے لیے۔

اگر ہمارے اساتذہ ایسی بے چین روح اور ایسا بے تاب جذبہ اپنے اندر رکھتے ہیں، اتنی غیر محدود صلاحیت کے مالک ہیں، ان کا رشتہ تعلیم سے براہِ راست ہے، تعلیم نے ان کے کانوں میں اپنا راز کہا ہے اور خدا کی مدد ان کے ساتھ شامل ہے اور اپنے کو اس کا نمائندہ سمجھتے ہیں تو وہ کامیاب معلم ہیں، ہزار آندھیاں چلیں، الحاد کے طوفان اٹھے، کیسے کیسے زلزلے آئیں لیکن ان کا جلایا ہوا چراغ روشن رہے، جیسے علامہ اقبال نے کہا ؎

ہوا ہے گو تیز و تند لیکن چراغ اپنا جلا رہا ہے
وہ مرد درویش جس کو حق نے دیئے ہیں انداز خسروانہ

## ازسرنو نظام تعلیم وضع کرنے کی ضرورت

اس وقت ساری دنیا میں ایک تعلیمی بے چینی پائی جاتی ہے، اگر ہمارے سیاسی رہنماؤں کو ان کے سیاسی مشاغل فرصت دیتے ان کے اندر یہ اخلاقی جرأت ہوتی تو اس پورے نظام تعلیم کی ازسرنو

اوور ہالنگ کرتے، عربی مدارس کے ایک وکیل کی حیثیت سے میں یہ بات نہیں کہہ رہا ہوں میرے لیے کوئی معذرت کی بات نہیں بلکہ ایک ایسے حقیقی انسان کی حیثیت سے جو زندگی کے میدان سے کنارہ کش نہیں کہ پوری دنیا کا نظام تعلیم اپنی افادیت بڑی حدتک کھو چکا ہے، اور یہ دنیا کی بڑی بدقسمتی ہے کہ سیاسی نقطۂ نظر اور معاشی مسائل ہمارے قومی رہنماؤں پر اتنے حاوی ہیں، کہ ان کو تعلیم کے بنیادی مسائل پر سوچنے کی فرصت نہیں، اور اگر کسی کو فرصت ہوتی ہے تو اس کو اس بارے میں جرأت مندانہ قدم اٹھانے کی توفیق نہیں ہوتی ہے۔(۱)

## کیمبرج اور آکسفورڈ میں تعلیمی قدامت

ہمارا پورا نظام تعلیم عرصہ سے لکیر کا فقیر بنا ہوا ہے، اس میں عربی مدارس کی تخصیص نہیں، میں نے کیمبرج اور آکسفورڈ کو دیکھا اور میں قصداً وہاں گیا، ایک معلم کی حیثیت سے گیا ایک زائر وسیاح کی حیثیت سے نہیں، میں آپ کے سامنے شہادت دیتا ہوں کہ میں نے وہاں کے بہت سے شعبوں میں قدامت پائی، اور آج ہمارا معاملہ کیمبرج اور آکسفورڈ کے نقش قدم پر بھی نہیں ہے، اس کے بھی کامیاب اور صاحب شعور مقلد نہیں۔

## نظام تعلیم کے لیے قرآن سے ہدایت حاصل کیجیے

نظام تعلیم اس سب سے بالاتر ہے، نظام تعلیم کی حکمرانی ساری سیاسیات اور معاشیات پر ہونی چاہئے، نظام تعلیم سیاست دیتا ہے، معاشیات دیتا ہے، نظام تعلیم ایک مقدس چیز ہے، اس کو سیاست اور سیاسی مقاصد کا ہرگز پابند نہیں کیا جا سکتا، نظام تعلیم زبانوں کے مسئلہ سے بالاتر، کتابوں کے ردو بدل سے بالاتر ہے، اس کا مسئلہ صرف یہ نہیں کہ ایک کتاب کو ہٹایا اور ایک کو بڑھایا جائے، نظام تعلیم کی توہین ہے، اگر یہ سمجھا جائے کہ یہ مراٹھی اور اردو زبان کا مسئلہ ہے یا یہ کہ فلاں ریاست کا مسئلہ ہے، وہ نبوت کا عطیہ ہے، وحی الٰہی کا پروردہ ہے، اس کا براہِ راست انسان کی روح اور اس کی ضمیر سے تعلق ہو وہ ان پستیوں پر اترنے کے لیے تیار نہیں ہوسکتا، نظام تعلیم کے لیے قرآن سے ہدایت حاصل کیجیے، انبیاء کرام کے صحیفوں سے رہنمائی حاصل کیجیے، قوموں اور تاریخ انسانی کے وسیع تجربات سے جو قوموں اور ملکوں کے حدود سے بالاتر ہیں، جو مشرق ومغرب کی پابندیوں سے آزاد ہیں آپ ان سے رہنمائی حاصل کیجیے۔

(۱) مرجع سابق، ص: ۷۷-۷۸۔

## انتہائی حساس اور نازک کام

قارئین: آپ مجھے معاف کریں میری یہ تحریر بے ہنگام آپ کے ذوق پر گراں نہ ہو، میں نے جو کچھ لکھا وہ یہ کہ جب آپ تعلیم کے مسئلہ پر غور کرنے کے لیے بیٹھیں تو تعلیم کے مسئلہ کا تقدس آپ کے سامنے ہونا چاہئے، اس کی پہنچائی اور وسعت آپ کے پیش نظر رہنی چاہئے، اس کی بلندی ورفعت آپ کے سامنے ہونی چاہئے، اس کے مزاج کی نزاکت آپ کے سامنے ہونی چاہئے، یہ کوئی ریاضی کا عمل نہیں جس میں جامد اعداد سے کام لیا جاتا ہو، یہ انجینئرنگ کا عمل نہیں جس میں اصول اور پیمانے استعمال کیے جاتے ہیں، یہ ایک انتہائی حساس اور نازک چیز ہے، اس کا دماغ شاہانہ اور ضمیر درویشانہ ہے۔ (۱)

(۱) مرجع سابق، ص:۸۰۔

# مبحث خامس: تعلیمی پسماندگی کے وجوہات اور حل

ہمارا محبوب وطن تعلمی میدان میں ہر دن گونا گوں ترقی حاصل کر رہا ہے سائنس وٹکنالوجی، تحقیق و ریسرچ، اختراعات وایجادات، انفارمیشن ٹیکالوجی، دفاع وقانون اور منیجمنٹ کی دنیا میں ہماری قابل قدر کامیابیوں اور بیش قیمت پیش رفت کو یورپ وامریکہ سمیت عالم عرب اور دنیا کے سارے ممالک نے سراہا ہے۔ ہمارے ملک میں تربیت یافتہ ڈاکٹر، انجینئر وسائنس داں پوری دنیا میں قدر کی نگاہوں سے دیکھے جاتے ہیں انہوں نے اپنے علمی کارناموں اور تحقیقی کاوشوں سے پیچیدہ مسائل کو حل کرنے میں حوصلہ افزا اقدام کیا ہے پر خطر نئی بیماریوں کا مؤثر علاج، داؤں کی ایجادات، فضائی تحقیق میں حیرت انگیز کامیابی اور اس طرح کے دوسرے کارناموں سے ان کا نام روشن ہے۔ علمی وتحقیقی میدان میں ہماری دوررس کامیابیوں کے باوجود ملک کی عمومی تعلیمی صورت حال ناگفتہ بہ ہے۔ ۱۹۵۱ میں ہمارے ملک کا تناسب ۸۱.۳ تھا جو ۲۰۰۱ میں بڑھ کر ۸۴.۶۴ فیصد تک پہنچا ہے مسلمانوں اور دلتوں کی تعلیمی صورت حال مزید ابتر ہے آزادی کے بعد سے ہی مسلمانوں کی تعلیمی صورت حال پر بحث و مباحثہ ہوتا رہا ہے اور ان کی پسماندگی کے ازالہ کے لیے موقع بموقع کوششیں بھی کی جاتی رہی ہیں۔ ۲۰۰۱ کے سروے کے مطابق مسلمانوں کا تعلیمی تناسب ۵۹.۰۱ فیصد ہے جب کہ دلتوں کا ۵۲.۰۲ فیصد ہے جب کہ قومی سطح پر ہمارے ملک تعلیمی تناسب ۶۵.۰۱ فیصد ہے مختلف ریاستوں کے عمومی تجزیوں سے پتہ چلتا ہے کہ جنوب کی کچھ ریاستوں میں مسلمانوں کی تعلیمی صورت حال بہتر ہے ۲۹/ میں سے ۱۰/ ریاستوں میں مسلمانوں کی تعلیمی صورت حال دوسرے طبقوں سے زیادہ ہے ان ریاستوں میں جھارکھنڈ، کرناٹک، مہاراشٹر، گجرات، آندھرا پردیش شامل ہے آندھرا میں عمومی تعلیمی تناسب ۶۱/ فیصد ہے جب کہ مسلمانوں کا تناسب ۷۸/ فیصد ہے اگر جنس کے اعتبار سے دیکھا جائے تو مسلم خواتین اور مردوں کا تعلیمی تناسب ۵۹/ فیصد اور ۷۷/ فیصد ہے جب کہ یہاں عام تناسب ۵۲/ فیصد اور ۷۳/ فیصد ہے۔ عمر کے مختلف مرحلوں کے اعتبار سے کئے گئے سروے میں بھی مسلمان دوسروں سے بہت پیچھے ہیں بلکہ ان کی حالت دلتوں سے بھی زیادہ ابتر ہے ملکی سطح پر جنرل ہندو ۸۰.۵ فیصد اور دوسری اقلیتیں ۷۵.۲ فیصد تعلیم یافتہ ہیں جب کہ مسلمانوں میں یہ تناسب ۵۹.۹ فیصد ہے ملک کے مرحلوں میں اس پسماندگی کو چاٹ سے سمجھا جا سکتا ہے اگر ہم اعلیٰ تعلیم کی بات کرتے ہیں تو ہمارے

ملک میں بیس اوراس سے زائد کے گریجویشن اور ڈپلوما کی ڈگری حاصل کرنے والوں کا تناسب ۷/ فیصد ہے جب کہ مسلمانوں میں یہ تعداد صرف ۴/ فیصد ہے ٹکنیکل گریجویٹ کا جہاں تک سوال ہے تو ہر ہزار ٹکنیکل گریجویٹ میں مسلمانوں کی تعداد صرف دو فیصد ہے یعنی صرف چار ہیں مسلمانوں کی کارکردگی اس معاملہ میں سارے مذہبی وسماجی طبقات سے کمتر اور افسوس ناک ہے۔ ملک کے اعلیٰ تعلیمی اداروں میں گریجویشن اور پوسٹ گریجویشن کررہے مسلم طلباء کا تناسب بہت کم ہے حالیہ برسوں میں یہ بحث ومباحثہ کا موضوع بنارہا ہے مثلاً ہندوستان کے دو چوٹی کے ادارے آئی آئی ٹی، اورآئی آئی ایم میں مسلم طلباء کا تناسب آٹے میں نمک کے برابر ہے۔ سال ۲۰۰۵-۲۰۰۴ میں انڈین انسٹی ٹیوٹ آف مینجمینٹ میں کل ۴۷۴۳ طلباء کا داخلہ ہوا جن میں مسلم طلباء کی تعداد ۶۳ تھی یعنی گویا وہ مجموعی تناسب کا صرف ۱.۳ فیصد ہے جہاں تک انڈین انسٹی ٹیوٹ آف ٹکنالوجی کا معاملہ تو سال ۲۰۰۵-۲۰۰۴ میں یہاں ۲۷۱۶۱ طلباء کے داخلے ہوئے جن میں مسلم طلباء کی تعداد صرف ۸۹۴ تھی یہاں انڈرگریجویٹ نے ان کے داخلے کا تناسب ۱.۷ فیصد تھا جب کہ پی جی میں یہ تناسب ۲ فیصد تھا۔ ملک کی مایہ ناز یونیورسٹیوں، کالجوں اورمیڈکل وپروفیشنل اداروں میں بھی مسلم طلباء کے داخلے کی صورت حال تشویش ناک ہے ان اداروں میں انڈرگریجویٹ میں ان کے داخلے کا تناسب ۲۵ میں ایک ہے جب کہ پوسٹ گریجویٹ میں ۵۰ طلباء میں ان کا تناسب صرف ایک ہے میڈیکل میں انڈر گریجویٹ میں مسلمانوں کا تناسب ۴ فیصد ہے۔

ملک میں مسلمانوں کی ہمہ جہت تعلیمی پسماندگی کا کرب شاید ہی کوئی مسلمان یا سیکولر انسان اپنے دل میں محسوس نہ کرتا ہو جامعہ امام ابن تیمیہ، مرکز علامہ ابنِ باز برائے دراسات اسلامیہ، ہند اوراس کے بانی ورئیس علامہ ڈاکٹر محمد لقمان السّلفی حفظہ اللہ پچھلی تین دہایوں سے مستقل ہندوستانی مسلمانوں کے تعلیمی زوال کو دور کرنے کے لیے شبانہ روز کاوش کررہے ہیں ان کی کاوشوں سے کروڑوں طلباء وطالبات مستفید ہوکر ہندوستان کے گوشے گوشے کو علم وعرفان کے نور سے جہالت کی تاریکیوں کا خاتمہ کررہے ہیں۔ جامعہ امام ابن تیمیہ نے مسلمانوں کی تعلیمی ترقی کے لیے بچے بچیوں کی اعلیٰ تعلیم کا انتظام کیا، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے اسٹڈی سنٹر شروع کیا۔ نیشنل کونسل فار پراموشن آف اردو لینگویج سے منظور شدہ کمپیوٹر سینٹر کا آغاز کیا، جامعہ میں ایم اے اور ٹیچرس ٹرینگ کی شروعات کی گئی، وہیں ڈاکٹر محمد لقمان السّلفی پبلک اسکول کا حسن آغاز ہوا مولانا آزاد پبلک اسلوک جلد ہی شروع ہونے کے قریب ہے جامعہ نے اپنی انہی کاوشوں کو آگے بڑھاتے ہوئے سالانہ تعلیمی

سیمنار کا سلسلہ شروع کیا۔ ۲۰۱۰ اس سلسلہ کے لیے بہت اہم کیوں کہ اس سال سیمنار کا موضوع ''مسلمانوں کی تعلیمی زبوں حالی۔ اسباب وعلاج'' تھا سیمنار میں شریک تمام علماء و مفکرین و مقالہ نگاران وخطباء نے اس موضوع پر کھل کر بحث ومباحثہ کیا مسلمانوں کی تعلیمی پسماندگی کی صورت حال کو جاننے، اس کے اسباب کے پتہ لگانے، اس کے ازالہ کے لیے منظّم ومنصوبہ بندکوشش کرنے اور اس سلسلہ میں علمی اقدام کرنے کے سلسلے میں اپنی قیمتی رائے پیش کیں۔



# خاتمہ

بیسویں صدی عیسوی میں ہندوستانی مسلمانوں کی تعلیمی پسماندگی-ایک جائزہ جیسے اہم موضوع پر قلم اٹھانا ایسا ہے کہ جیسے سورج کے سامنے چراغ دکھانا اوراس اہم موضوع کو زیر قلم لانا غیر معمولی علم کا تقاضا کرتا ہے، نیز میں کن الفاظ میں اور کس طرح شکریہ ادا کروں اس رب کریم کا جس نے اس حقیر کو اس اہم موضوع پر کام کرنے کی توفیق بخشی،اور کس طرح شکریہ ادا کروں مدرسہ کے ذمہ داران کا کہ جنہوں نے نہ صرف یہ کہ مقالہ لکھنے کی اجازت فرمائی؛ بلکہ اس کو لازمی قرار دیا، ورنہ میری کیا بساط کہ میں اس اہم موضوع پر قلم اٹھاتا۔

امید ہے کہ اگر اس کے لکھنے میں کسی بھی طرح کی کوتاہی ہوئی ہوگی تو ذمہ داران متنبہ فرمائیں گے۔ان شاءاللہ

# مصادر ومراجع



| نمبر شمار | اسمائے کتب | اسمائے مصنفین | مطبوعہ |
|---|---|---|---|
| ۱ | تاریخ ہندوستان ( آب کوثر ) | شیخ محمد اکرام | ادبی دنیا مٹیا محل دہلی |
| ۲ | نظام تعلیم مغربی رجحانات اور اس میں تبدیلی کی ضرورت | مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ | سید احمد شہید اکیڈمی، رائے بریلی |
| ۳ | ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت | مولانا مناظر احسن گیلانیؒ | مکتبہ الحق ماڈرن ڈیری، ممبئی |
| ۴ | دینی مدارس نصاب، نظام تعلیم اور عصری تقاضے | مولانا ڈاکٹر حقانی میاں قادری | فضلی سنز کراچی، پاکستان |
| ۵ | اداریہ: ہندوستانی مسلمانوں کی تعلیمی صورتحال اور جامعہ امام ابن تیمیہ کی پیش رفت | ظل الرحمٰن لطف الرحمٰن تیمی | دینی و علمی ماہنامہ ''طوبیٰ'' |
| ۶ | بلاگ: مدارس اسلامیہ کا نصاب اور عصر حاضر کے تقاضے | مفتی محمد عارف باللہ القاسمی | muftiarifbillah.blogspot.com |